مارچ تا مئی ۱۹۸۱

ماہنامہ حیاتِ نو

مدیر منتظم : نور محمد فلاحی
مدیر تحریر : عبید اللہ فہد
قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ ۵ پیسے
سالانہ زرِ تعاون پندرہ روپیے

اس دائرے میں سرخ نشان
اس بات کی علامت ہے کہ
آپ کا سالانہ زر تعاون ختم
ہوچکا ہے براہ کرم سالانہ زر تعاون
مبلغ ۱۵ روپئے ارسال کرکے مشکور فرمائیں
ادارہ

جلد ۳ شمارہ ۳-۴-۵ ربیع الثانی تا جمادی الاخری، مارچ تا مئی ۱۹۸۱ء

دھڑکنیں

آستین کے سانپ — اداریہ — ۲

مقالات

ہمارے دینی مدارس — (عبد القوی فلاحی) — ۴
نظریہ فرائڈ کا تقابلی مطالعہ — (عبید اللہ فہد) — ۱۳
شریعت اسلامی مکمل شریعت — (شفیق عالم فلاحی) — ۲۳
ہندوستان میں سگریٹ نوشی — (الیاس شیدا قادری) — ۲۳
روسی سامراج کی ہمسایہ ممالک پر یلغار — (محمد صابر قلی نما) — ۵۰

امام عصر کے حضور میں

مقام مودودی رح — (عبد المجیب مدینہ) — ۱۶
مولانا مودودی رح اور مجددیت — (ابو محمد امام الدین) — ۳۸

چمنستان ادب

حقدار کون؟ — (طارق احسن فلاحی) — ۲۵
اردو نثر کے فروغ میں دکن کا حصہ — (ڈاکٹر احمد سجاد) — ۳۵

اللہ والوں کی خدمت میں

ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور — (اڈیٹر ایشیا) — ۵۴
مکتوب فرقان — (حبیب بھائی نائجیریا) — ۳

رپورتاژ

محبتوں اور عقیدتوں کی دو روزہ تقریب — (سکریٹری انجمن ندوہ) — ۳۳
عقیدت و محبت کے آنسو — (ناظم اجتماع) — ۹

حلقۂ ادب

اسلام اللہ پریمی — (فرقان زہری) — ۳۱

اڈیٹر کی نظر میں

یتیم خانہ کی کہانی، جماعت اسلامی کے سلسلہ میں چند سوالات — ۳۰

غزلیات

شیدا قادری — ۸
ابو المجاہد زاہد — ۱۸
ابو البیان حماد — ۲۹

ماہنامہ حیات نو بلریاگنج اعظم گڑھ
مطبوعہ نشاط پریس ٹانڈہ

تحریک ادب میں صحافت انسانی ذہن کو ڈھالنے کا ایک موثر ذریعہ ہے ——— (مجدد مودودی رحمہ اللہ)

آستین کے سانپ

ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اور اس کے ہفت روزہ "آرگن" "حیات" کی اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی قابل فہم ہے، بھٹو کی حالیہ رہائی کے موقع پر کشمیر میں کمیونسٹوں نے جو سازشیں کرنی چاہی تھیں اور اسلام پسندوں کو جانی و مالی نقصانات پہونچانے کا جو خفیہ منصوبہ تیار کیا تھا، وہ اب قریب قریب بے نقاب ہو چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی عبداللہ حکومت نے درجنوں کمیونسٹ شر پسندوں کو گرفتار کیا ہے۔

لیکن ٹھیک اس وقت جبکہ کشمیر میں اسلام دشمنی کا یہ ڈرامہ اسٹیج ہونے جارہا تھا، ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی ایک نام نہاد جماعت نے تحریک اسلامی اور اسلام پسند طلبہ اور نوجوانوں کا سماجی بائیکاٹ کرنے ان کے خلاف مذمت کی قراردادیں پاس کرنے اور ان کے دفاتر کا گھیراؤ کرنے کا سرکلر جاری کیا، کہنے کو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دراصل معاصرت کا فتنہ ہے جس کا کسی سوچی سمجھی سازش سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں، لیکن ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس نام نہاد جماعت کی کمیونسٹوں سے ملی بھگت قائم ہے، ایک معاصر سہ روزہ کے بقول اس تنظیم (ایس آئی ایم) اور اس کے ساتھ جماعت اسلامی کو ختم کرنے اور "مجھ مقتول نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں" کے تحت حکومت ہند کو مواد فراہم کرنے کی کوشش کرنا دراصل وہ کام تھا جو اب تک سامپردائکتا ورودھی کمیٹی اور کمیونسٹوں نے انجام دیا تھا، اور اب یہ کارِ خیر گویا "اصحاب تقویٰ" نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

ہماری یہ بات اس وجہ سے اور بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہے کہ اگر یہ معاصرت کا فتنہ ہوتا تو کم از کم اپنے مکتب فکر سے وابستہ اسلام پسندوں کا ساتھ ہوتا۔ لیکن ابھی دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر اس طائفہ نے دیوبند کے علماء کو جو زبردست دھوکہ دیا ہے اور خود ہی اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی دیرینہ آرزو کی تکمیل کی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام پسندوں سے ان کا ذرا بھی تعلق نہیں، یہ کسی طاقت کے آلۂ کار ہیں اور آستین کے سانپ بن کر دین و ملت کے نام پر دین و ملت ہی کی تجارت کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ عوام آستین کے ان سانپوں سے ہوشیار رہیں۔

اِحْذَرْ مِنَ الْعَدُوِّ مَرَّةً وَاحْذَرْ مِنَ الصَّدِيقِ أَلْفَ مَرَّةٍ۔

★

کھلا خط

مکتوبِ مجیب قاسمی بنام مولوی منظور نعمانی

مکرمی و محترمی! مزاج عالی۔

آپ کے موقر مجلہ "الفرقان" ماہ اکتوبر و نومبر کے جواب میں خاکسار کے تاثرات درج ذیل ہیں، امید ہے آپ ضرور اپنے احساسات سے مطلع فرمائیں گے۔ یہ آپ نے کیا کیا کہ اس شخص پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی، جو اب اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے، مگر دنیا کے ہر گوشے میں پائی جانے والی ایک عالمی اسلامی تحریک چھوڑ گیا ہے، جو دنیا کی تمام باطل تحریکی طاقتوں کے خلاف ایک عظیم چیلنج ہے۔ کاش آپ نے مسلم اقلیت نمبر نکالا ہوتا اور اس میں فلسطین، ارٹیریا، قبرص، روس اور ہندستان میں مسلمانوں پر گذر رہی ہوتی اور روز بروز ٹوٹتے جانے والی قیامتوں کا جائزہ لیا ہوتا اور امت اسلامیہ کو ان کی مدد کی دعوت دی ہوتی۔ کاش سوشلزم نمبر نکالا ہوتا اور اسلام کی حقانیت ثابت کر کے سوشلزم کی دھجیاں اڑا دی ہوتیں۔ کاش افغانستان نمبر نکالا ہوتا اور افغانستان میں غیر ملکی اور ظالم روسی فوجوں کے ہاتھوں، معصوم مسلمان بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے اپنے ہی گھر کے آنگن میں زندہ درگور کئے جانے کے واقعات کا تذکرہ کر کے ظالم روس کے گھناؤنے چہرے سے پردہ اٹھایا ہوتا اور روس کے خلاف مسلمان حکومتوں اور مسلم عوام کو متحد ہونے کی دعوت دی ہوتی۔ کاش آپ نے جہاد نمبر نکالا ہوتا اور مسلمانوں کو باطل طاقتوں کے خلاف زندگی کے ہر مرحلے میں جہاد پر ابھارتے۔ کاش اسلامی وحدت نمبر نکالا ہوتا اور مسلمانوں کو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بننے کی دعوت دی ہوتی۔ محترمی! آپ نے جو (شخصی) مودودی نمبر نکالا ہے اس سے اسلام کی کون سی اور کیسی خدمت مقصود ہے، میرے خیال میں تو اس سے اسلام کی خدمت نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو تفریق و تشتت میں مبتلا کر کے اسلام کی بیخ کنی کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ کاش آپ نے حضرت امیر معاویہؓ کا جواب سامنے رکھا ہوتا، جو انھوں نے عیسائی حکمران کو بھیجا تھا، جبکہ وہ خود حضرت علیؓ سے برسر پیکار تھے۔ اسلام دشمن طاقتیں جتنی متحد اب ہیں شاید پہلے کبھی نہ تھیں، آپ نے مسلمانوں کی خود ساختہ کمزور دیواروں میں مزید دراڑیں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ امت اسلامیہ آجکل جن حالات کا شکار ہے، وہ کسی بھی بیدار مغز اور سنجیدہ مسلمان سے تو کیا ایک عام مسلمان سے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ امت مسلمہ ایک انتہائی نازک دور سے گذر رہی ہے اور آپ جیسے خود ساز مسلم قائدین ایک دوسرے پر کیچڑ اچھال کر دشمنوں کیلئے مزید ہنسنے کا موقع فراہم کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ "اس کے علاوہ میں نے ان واقعات کا ذکر اس لئے بھی ضروری سمجھا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آجکل کے مولانا مودودی صاحب کے کٹر متبعین (جن کے علم دین کا سرمایہ صرف مولانا کی تصانیف ہیں) وہ ان کو ایک ممتاز عالم اور مصنف ہی نہیں، بلکہ اس دور کا مجدد بلکہ امت محمدیہ کا مجدد اعظم یقین کرتے ہیں۔" مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری مد ظلہ العالی جو ایک ممتاز عالم دین عظیم صحافی اور مصنف ہیں، "ادارہ حیات نو" کو تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "جب سے حضرت مولانا مودودیؒ کی وفات ہوئی ہے، مرحوم کے متعلق برصغیر اور عالم اسلام کے ہر طبقہ کے افراد و اشخاص کے خیالات دیکھنے میں آئے، مگر مرحوم کے متعلق کسی نے مجدد کا لقب استعمال نہیں کیا، حیات نو کے زیر نظر شمارہ کے سرورق پر پہلی بار 'مجدد مودودی' دیکھنے کو ملا۔" گویا معلوم ہوا کہ آپ (مولوی منظور نعمانی) اپنی تحریر میں اشارہ غالباً برکھنج کی "الفلاح سوسائٹی" کی طرف کر رہے ہیں، کیونکہ اس سوسائٹی نے مولانا مودودیؒ کو مجدد کہنے میں سبقت کی۔ چونکہ میں بھی اس سوسائٹی کا ایک ادنیٰ فرد ہوں اور میری ابتدائی تعلیم و تربیت اسی سوسائٹی میں ہوئی ہے، اس لئے آپ کے بے بنیاد الزامات کا جواب دینا میرا عین فرض ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ "جن کے علم دین کا سرمایہ صرف مولانا مودودی کی تصانیف ہیں" کیا آپ کے

از قلم:
عبدالقوی فلاحی
طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

ہمارے دینی مدارس

میں اس سخت جان دینی نظام تعلیم کے حق میں اپنے جذبۂ اعتراف کو پیش کرتا ہوں کہ نہایت ناسازگار ماحول میں اس نظام نے اپنے آپ کو سالہا سال سے برقرار رکھا ہے، وہ اشخاص اور ادارے بڑے ہی قابل قدر ہیں جنھوں نے اسلام کے بالکل خلاف کام کرنے والے نظام اجتماعی کے دائرے میں بہت کم آمدنیوں میں دینی تعلیم گاہوں کو چلایا، اور روکھی سوکھی کھا کر اور درویشانہ رہن سہن اختیار کرکے ایک ملی خدمت کے لئے بیٹھ گئے۔ پھر قابل داد ہیں وہ فرزندان ملت بھی جنہوں نے دنیوی ترقیات سے قطع نظر کرکے دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنی زندگیاں کھپا دیں انھیں قربانیوں کا یہ کم سے کم حاصل ہمارے سامنے ہے کہ کسی نہ کسی درجے میں اسلام کے آثار فضا میں باقی ہیں۔

یہ اعتراف میرے دل میں ہمیشہ رہا اور ہمیشہ رہے گا، مگر اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے اس دینی نظام تعلیم کو ناقدانہ نقطۂ نظر سے بھی دیکھتا ہوں اور بڑی بے چینی سے یہ چاہتا ہوں کہ اس میں تعمیری تبدیلیاں جلد از جلد واقع ہونی چاہئیں، ورنہ جو کچھ جس ڈھب سے چل رہا ہے، زیادہ دیر تک چل سکے گا۔ میرے اندر ان سرگرمیوں کے لئے کبھی تنقیص یا تحقیر کا جذبہ نہیں رہا، لیکن میں ان کمزوریوں اور کوتاہیوں سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا جو موجود ہیں اور اگر ان کو زیر بحث نہ لایا گیا تو وہ ہمیشہ موجود رہیں گی اور ان کی موجودگی اس عظیم الشان کام کے اصل مقصد کو نقصان پہونچا رہی ہے اور مزید نقصان پہونچائے گی۔

میرا جذبۂ خیر خواہی دامن گیر ہو کر تقاضا کرتا ہے کہ میں بزرگان ملت کو ان کمزوریوں کے ازالے کی طرف اس امید کے ساتھ متوجہ کروں کہ وہ اپنے سے ایک ادنیٰ آدمی کی بات سننے کے لئے اونچا ظرف رکھتے ہیں۔

سب سے پہلے تعلیم کی تمدنی اہمیت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ انسان سازی کے پروگرام میں سب سے پہلے خاندان پھر مکتب اور پھر معاشرہ کا مجموعی ماحول حصہ لیتا ہے۔ مکتب کے اثرات تربیت فکر و عمل میں اس بنا پر بہت زیادہ دخیل ہوتے ہیں کہ یہ ادارہ ہمہ تن اس مقصد کے لئے وجود میں آیا ہے اور اس کے اندر طلبہ دن کا ایک بڑا حصہ اکتساب میں گذارتے ہیں۔ تعلیم ایک نسل کے نظریاتی و تجرباتی سرمائے کو بعد کی نسل تک منتقل کرنے کا ذریعہ ہے۔ متفرق نظریات چونکہ کسی نظریہ کے گرد مجتمع اور مرتب ہوتے ہیں اس لئے کسی نظام تعلیم میں سب سے بڑی اہمیت نظریے کی ہوتی ہے اور ہر نظریہ ایک خاص طرز کا کردار پیدا کرتا ہے۔ اس وجہ سے ہر نظام تعلیم انسانیت کی تعمیر و تشکیل کے لئے ایک سانچے کے طور پر کام کرتا ہے۔ یہی تعلیم دراصل زندگی کے فلسفے اور زندگی بسر کرنے کے صحیح اسلوب و فن پر مشتمل ہوتی ہے۔ تعلیم کی تمدنی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ درسگاہ بڑے بڑے انقلابوں کی پرورش گاہ ثابت ہوتی ہے اور معلم ایک چلتے ہوئے نظام کو زیر و زبر کر دینے کا وسیلہ بن سکتا ہے۔

تعلیم کی یہی اہمیت تھی جس کے پیش نظر ہماری تاریخ میں تعمیر و

اصلاح کے داعی جب کبھی بھی سیاست کے دائرے میں خوفناک مزاحمتوں کے سبب پسپا ہوتے ہیں تو انھوں نے بلا تامل تعلیم کے مورچے سنبھال لئے ہیں۔ بنو امیہ کے دور استبداد میں اصلاح پسند عناصر نے فقہ و اجتہاد کی مجالس اور اکیڈمیوں کو قائم کیا اور ان کے ذریعہ نوجوان طاقت کو اپنے گرد سمیٹا اور ان کے سینوں میں نظریہ حق اور نظام خیر و شر کے بیج ڈالنے کا پورا پورا اہتمام کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایسا علمی اور تحقیقی لٹریچر تخلیق کیا تاکہ وہ معاشرہ کے مجموعی ماحول پر تادیر اثر انداز ہوتا رہے۔ اسی طرح تاتاریوں کے تاخت کے بعد جب قصر [illegible] بڑا دھکا تعمیری رجحانات کو پہونچا تو اسی کے رد عمل کے تحت تصوف نے ایک نیا محاذ قائم کر دیا۔ یہ خانقاہی نظام تعلیم و تربیت تھا۔ اس کا اصل منشا یہ تھا کہ ناساز گار حالات میں عملی سیاست سے الگ تھلگ رہ کر ایسے حلقے منظم کر دئے جائیں جن میں یکی خدا پرستی، دنیا سے بے نیازی، ایثار، روح قرآنی، حسن خلق اور دعوت الی اللہ کا داعیہ موجود ہو۔ گوشہ ہائے خلوت میں بیٹھ کر اس طرح کا سرمایہ محفوظ کرنے کا ایک مجبوری دور گذر جائے اور پھر جب بھی حالات موقع دیں تو اس سرمایہ کو اجتماعی دائرے میں کھپا دیا جائے۔ مگر بدقسمتی سے انفرادی روحانیت کا کیف اصل مقصود سے تغافل کا موجب بن گیا اور تصوف اجتماعیت کے مقابلے میں بجائے خود ایک مستقل نظام بن کر رہ گیا۔ اسی طرح ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے انہدام کے بعد جب نظام حیات کی باگ ڈور پوری طرح الحاد اور سیکولرزم کے قبضے میں چلی گئی تو دعوت اسلامی کے علمبردار مسجدوں اور حجروں میں تعلیمی مراکز کھول کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ایک وقت میں دیوبند نے بھی اور ندوہ نے بھی اپنے طرز خیال کے کردار تیار کر کے سیاسی و اجتماعی سرگرمیوں میں بڑا اثر ڈالا ہے، لیکن یہاں بھی وہی ہوا کہ آہستہ آہستہ اصل نصب العین اور اس کے وسیع تقاضے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور ہماری دینی درسگاہیں فقط خطیب، مناظر، مفتی اور مدرس پیدا کرنے میں لگ گئیں۔

تاہم ہمیں کوئی شک نہیں ہے کہ ہماری تعلیمی تحریکیں اولاً ایک انقلابی تعمیری رجحان کے تحت رونما ہوتی ہیں اور ان کا منشا نظام حق کے ایسے علمبردار پیدا کرنا تھا جو نظریہ اسلامی کے علمبردار ہوں، اور دنیاوی مفاد کو تج کر رضائے الٰہی کے لئے انقلابی تحریک بپا کرنے میں معتدبہ وقت پر ادا کر سکیں۔ اب یہ اس ملت کی بدقسمتی ہے کہ آج جبکہ حق و باطل کی کشمکش زوروں پر ہے اور ایک فیصلہ کن مرحلہ درپیش ہے، ہمارے دینی مراکز تعلیم اس معرکہ کی پشت پناہی کرنے اور اس میں بہترین افرادی کمک پہونچانے کا فریضہ ادا نہیں کر رہے ہیں۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دینی مدارس کی روح میں جمود آ گیا ہے اور یہ زندگی کے اسلامی نظریہ و اسلوب کی تعلیم سے طلبا کو کما حقہ مالا مال کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ آئندہ دور اور تیار ماحول کی ضرورت کے مطابق ذہن و کردار کی تعمیر نہیں ہو پا رہی ہے۔ بس اب کسی تامل کے بغیر اس تعلیمی نظام کا پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اسی لئے اگر اس نظام کے کار پردازوں کی طرف سے کچھ بھی تعداد غور و فکر کے لئے تیار ہو تو چند نکات ایسے پیش کر رہا ہوں جن کو پیش نظر رکھ کر دینی مدارس کی موجودہ ہیئت میں تغیر پیدا ہو سکتا ہے۔

ہماری دینی درسگاہوں کے کار پرداز پہلا نکتہ یہ سامنے رکھیں کہ اسلام زندگی کے سیاسی و اجتماعی مسائل اور تمدنی و اجتماعی معاملات سے کٹے ہوئے انفرادی مذہب کی تعلیم نہیں دیتی ہے بلکہ ایک تحریکی فلسفے اور ایک اجتماعی نظام زندگی کی تعلیم دیتی ہے۔ بدقسمتی سے اب تک کی تعلیمی سرگرمیاں انفرادی مذہب سکھانے کے لئے نئے اسلوب پر جاری ہیں۔ چند عقائد اور ان کے متعلق کلامی بحثیں، بنیادی عبادات اور ان سے متعلق فقہی مسائل، انفرادی اخلاق و آداب کا ایک ضابطہ اور اس کے متعلق مواعظ و ملفوظات، فرقوں کے اعتقادی و فقہی نظام کے مناظرانہ و مجادلانہ طریق فکر اور مسلمانوں کے پرسنل لاء کی حد تک بالکل مقلدانہ اور غیر اجتہادی قانونی تیاری، بس ان چیزوں پر ہمارے دینی نظام تعلیم مشتمل ہے۔ یہ دینی نظام تعلیم برسوں کی کاوش کے بعد بھی ایسے افراد تیار کر کے نہیں دیتا جو عالمگیر پیمانے پر زندگی اور تمدن سے

وسیع نظریات و مسائل پر اظہار خیال کر سکیں جن کے پاس اعلیٰ درجے کے عقلی معیارات موجود ہوں اور جو ماحول کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں اور زندگی سے من حیث المجموع دلچسپی لیں۔

دوسرا قابل غور نکتہ یہ عرض ہے کہ کسی بھی نظریہ و فکر کے لئے صرف ایسے افراد کار آمد ہوتے ہیں جو فعال و متحرک ہوں اور اپنے نظریات کی برتری کا پورا پورا شعور رکھتے ہوں، مگر ہمارے نقشۂ کار میں کوئی ایسی گنجائش موجود ہے کہ ہم اسلام کی علمبرداری کیلئے بدلتے لئے ایک ہی ذہن سے کا جو کردار پیدا کر رہے ہیں، وہ فعال اور متحرک اور ذہنی و فکری برتری کا شعور رکھنے والا نہیں، بلکہ بالعموم گوشہ گیر، سیاست گریز، جامد، منفعل، مضمحل، یاس زدہ، پسپائی پسند اور منفعت کیش ہے، یہ اتنے سارے سخت الفاظ، خدا شاہد ہے کہ کسی جذبۂ نفرت یا تنقیص سے نہیں کہے جا رہے ہیں، بلکہ امر واقعہ کو چونکہ ان کے بغیر واضح نہیں کیا جا سکتا، اس لئے بڑی درد مندی سے عرض کئے جا رہے ہیں۔

آپ خود جائزہ لے کر دیکھیں تو قلیل سی ایک تعداد کو چھوڑ کر دینی مدارس کے پیدا کردہ انسان کو ہم زندگی کے اجتماعی ہنگاموں سے بالکل منقطع پاتے ہیں، وہ موجوں کی کشاکش سے ہٹ کر دور ساحل پر بیٹھا نظر آتا ہے، وہ مخالف اسلام رجحانات اور انھیں لے کر چلنے والے با اثر طبقات سے مرعوب اور ان کے مقابلے میں کسی قدر کمتری کے احساس میں مبتلا ہے، وہ باطل اور بدی سے دور رہنا چاہتا ہے، مگر اس سے نبرد آزمائی نہیں کرتا، وہ اپنے مشاغل کے ایک محدود دائرے میں پناہ گزیں ہے۔ کاش کہ ہماری دینی درسگاہیں اس حقیقت کو محسوس کر کے اپنے نظام کار کو بدل ڈالیں۔

جدید علوم کا مطالعہ

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کے لئے جدوجہد کرنا مطلوب ہو تو ہمیں ایسے ذہن کی ضرورت ہے جو دور حاضر کے ذہن کو بے تکلفی سے مخاطب کر سکے، دور حاضر کے ذہن کو اپنے قوم کے دائرے کے اندر بھی اور وسیع تر بین الاقوامی دائرے میں بھی مخاطب اور متاثر کرنے کے لئے شرط اول یہ ہے کہ اس کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو، اس کے علمی اور معلوماتی پس منظر کا احاطہ کیا جائے، وہ جس طرح کی کشمکش سے دوچار ہو اس کا پورا پورا اندازہ ہو اور اس کے سامنے آج جو مسائل جس شکل میں آ گئے ہیں اور ان کے ساتھ جو کچھ استدلال موجود ہے اس سے داعی باخبر ہو، یہ صلاحیت دینی مدارس اپنے طلبہ میں نہیں پیدا کر سکتے، جب تک کہ وہ جدید فلسفہ، نفسیات اور سیاسیات و معیشت کے علوم سے انھیں مالا مال نہ کریں اور انھیں مغربی نظام حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ نہ کرا دیں، اس مقصد کو مروجہ نصاب ہرگز پورا نہیں کر سکتا۔

عجب بات ہے کہ بار بار ملت کے اصحاب نظر نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ دینی نصاب میں ایک بڑی تبدیلی ہونی چاہئے مگر ہم درس نظامی کے چکر سے نہیں نکل سکتے اور نہ اس کے تنگ دائرے کو وسیع کر سکتے ہیں، درس نظامی بڑی ذہنی کاوشوں سے مرتب کیا گیا ہے اور وہ بڑی شے ہے، مگر حالات اور ضروریات نے ایسی نئی مانگیں پیدا کر دی ہیں کہ وہ ان کو پورا نہ کریں تو جمود چھایا رہے گا، زمانہ آگے آگے دوڑتا جائیگا اور ہم پیچھے ہی پیچھے گھسٹتے رہیں گے، ہم پیچھے گھسٹنے والوں کی آواز آگے دوڑنے والی منحرف طاقتیں کبھی نہیں سنیں گی، ان کو متاثر کرنے کیلئے ان کے ہم دوش ہو کر مسابقت کرنا ضروری ہے۔

آج اگر ایک داعی حق نظریہ ارتقا کو نہیں جانتا، اگر وہ ضبط ولادت کے اساسی تصورات سے آگاہ نہیں ہے، اگر وہ تجزیۂ نفسی کے مختلف مدارس فکر سے بیگانہ ہے، اگر اسے

ڈکنزم سے آگاہی نہیں ہے، اگر وہ جدید فلسفہ تاریخ سے
حارت نہیں رکھتا، اگر اسے بین الاقوامی سیاست کا شعور نہیں
ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ چند عقیدوں اور عبادتوں اور اخلاقی
ہدایات پر وعظ سنا کر نئی نسلوں کو اپنے گرد سمیٹ سکے، حال یہ
ہے کہ موسمیات اور دنیا کے طبعی جغرافیہ سے بھی ہمارا دینی نظام طلبہ
کو بقدر ضرورت واقف نہیں کراتا، اس سے بھی آگے بڑھ کر
ہماری کمزوری کی حد یہ ہے کہ ہمارے تیار کردہ افراد اس زبان
اور ان اصطلاحات اور اسالیب سے بھی آگاہ نہیں ہیں جو اس
دور کے ذہن کے لئے مؤثر ہیں، انگریزی تو انگریزی ہم ادبی
معیار کی اچھی اردو سے بھی طلبہ کو آراستہ نہیں کر رہے ہیں۔

تمدنی زندگی میں مقام

چوتھا نکتہ یہ قابل غور ہے کہ کوئی نظام تعلیم اسی صورت
میں کامیابی سے چل سکتا ہے جبکہ وہ اپنے سانچوں میں ایسے
انسان ڈھال کر دیتا ہے جو عملاً ایک دور تمدن میں اپنی جگہ
بنا سکیں۔ ہر نظریاتی نظام تعلیم کو کارفرما اور کارکن عناصر
تیار کرنا ہوتے ہیں، درسگاہوں سے طلبہ نکلیں تو زندگی
کے کاروبار تمدن میں کوئی نہ کوئی مقام ان کو طلب کرے
ان میں ایسی صلاحیتیں ہونی چاہئیں کہ وہ تمدن کے کسی نہ
کسی شعبے یا ادارے کو چلانے کے اہل ہوں، وہ میدان میں
آئیں تو نظام رائج سے کشمکش کرتے ہوئے بھی معاش کے
راستے نکال سکیں، زندگی ان کی ضرورت محسوس کرے
تمدن میں ان کی مانگ ہو، وہ اول تو کسی شعبے میں اچھے لیڈر
اور کارپرداز ثابت ہوں، ورنہ کم از کم اچھے کارکن تو ضرور
ثابت ہوں۔ افسوس ہے کہ ہمارا مروجہ دینی نظام تعلیم ایسے
افراد تیار کر کے نہیں دے رہا ہے جو صحافت و ادب اور تصنیف
و تالیف سے لے کر تجارت و صنعت اور ڈاکٹری، انجینیری اور
حساب و بنک کاری وغیرہ گوناگوں مشاغل کو اپنا سکیں، اس
کی یہ حالت ہے کہ بارہ بارہ سال تک کی دینی تعلیم پا کر

نوجوان طالب علم ایک ٹک نہیں بن سکتا کہ وہ حلال روزی
اپنے حلقہ ربط میں زبان و عمل سے دین و عمل کی دعوت دیتا
رہے، کل اگر یہاں نظام اسلامی کو چلانے کے
کی مانگ پیدا ہو تو ہمارا دینی نظام تعلیم اس مانگ
کر سکتا۔

ان نکات چہارگانہ کو پیش کرنے میں بہ نیت
اصلاح سے دینی مدارس کے کارپردازوں کی خدمت میں
رکھتا ہوں کہ وہ کسی ایسے نقشے پر کام کریں کہ طلبہ ان
دس بارہ سال میں فارغ ہوں تو وہ ایک طرف اسلام کا ایک
نظام زندگی کی حیثیت سے ماہرانہ مطالعہ رکھتے ہوں اور دوسری
طرف میٹرک یا ایف اے کے درجات کے مساوی انگریزی اور
جدید تعلیم کی تعلیم سے آراستہ ہو کر نکلیں، تاکہ مزید تعلیم حاصل
کرنے کے لئے ان پر پورا میدان کھلا رہے، جدید علوم کے
حساب کو جوں کا توں لے لینے کے بجائے اسلامی نظریہ حیات
کی روشنی میں ناقدانہ طریق پر مطالعہ کرایا جائے، تاکہ مغربی نظریات
کی کمزوریاں نمایاں ہوں اور اسلامی تصورات کی برتری کا سکہ
ذہنوں میں بیٹھ جائے، ایسے کورس تیار کرائے جا سکتے ہیں
جو اسلامی اور مغربی تصورات کا ہر دائرے میں تقابلی مطالعہ
اور اسلامی تصورات کا ثبوت ہو اور مغربی تصورات کی تردید
اس کے ساتھ دینی درسگاہوں کے ماحول کو بھی اس جمود سے
نکالا جائے جس میں وہ برسوں سے پڑا ہے، طلبہ کو سادگی کے
ساتھ صاف ستھرے رہن سہن کی تربیت دی جائے تاکہ
ان میں عزت نفس کا احساس زندہ ہو اور وہ کسی نفسیاتی الجھن
میں نہ پڑیں، اس سلسلے میں امدادی نظام کو بھی نئے سرے سے
استوار کرنا چاہئے۔

حیات نو کا خریدار بن کر اس تحریکی مہم کو آگے بڑھائیے

شیدا قادری

غزل

حاصل نہیں ہے اے دل کچھ نالہ و فغاں سے
پیدا مسرتیں کر کشتِ غمِ نہاں سے

محدود ہوں عزائم کیوں تیرے اس جہاں تک
اقدام کیوں نہ تیرا آگے ہو اس جہاں سے

اے زیست کے پجاری مانوسِ مرگ ہو جا
ناداں کیوں گریزاں عمرِ جاوداں سے

جینے پہ مر رہا ہے گو زندگی ہے دوبھر
حاصل ہی کیا ہے آخر اس سعیِ رائیگاں سے

کر ٹھوکروں سے اپنی عالم میں حشر برپا
بانگِ رجز کو ٹکرا دے ہفت آسماں سے

مانوس آفتوں سے قلب و دماغ کو کر
بے خوف کھیلتا جا تو جورِ آسماں سے

[illegible] اپنے خاروں کو گل بنا دے
مخصوص کر بہاروں کو اپنے گلستاں سے

ہر خارِ گلستاں کو خونِ جگر پلا کر
سو گلستاں پیدا کر ایک گلستاں سے

بن رحمتِ مجسم خود زحمتیں اٹھا کر
معمور کر جہاں کو اک کیفِ جاوداں سے

گر بن سکے تو ٹوٹے دل کی تسلیاں بن
زخمِ جگر کو بھر دے شیرینیِ زباں سے

شیدا رہینِ جرأت سودائے عشق کو کر
جوشِ جنوں کو ٹکرا دے ہفت آسماں سے

ڈاکٹر اطہر ریحان فلاحی

عقیدت و محبت کے آنسو

انجمن طلبۂ قدیم کے پہلے دوسالہ کنونشن منعقدہ ۷، ۸ مارچ کی پہلی نشست میں ناظم اجتماع برادر اطہر ریحان فلاحی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے عقیدت و محبت کے یہ نذرانے پیش کئے، ہمارے اکثر رفقاء کی آنکھیں نمناک تھیں۔

بعد تسبیح خالق اکبر
اور تسلیم فخر جن و بشر

جناب صدر، محترم اکبر آبادی صاحب، مہمانانِ گرامی اساتذۂ کرام اور دور دور سے آئے ہوئے ہم صفیرو و ہم نفسو! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

حضرات! مادرِ درسگاہ کے اس وسیع و عریض احاطہ میں آپ کا خیر مقدم کرتے ہوئے عقیدت و احترام خلوص و محبت کے جذبات میرے دل میں موجزن ہیں، ان کو میں پیرایۂ بیان میں پرونے سے قاصر ہوں، اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود کہ الفاظ صرف جذباتِ دل کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے بلکہ بیگانۂ احساس ہوا کرتے ہیں، مجھے انہی کا سہارا لینا پڑا ہے، میں خلوص دل سے آپ لوگوں کا استقبال کرتا ہوں اور فرطِ عقیدت و محبت کے آنسو نذر کرتے ہوئے دل و جان فرشِ راہ کرتا ہوں، خزاں کا یہ موسم مجھے یہاں فصلِ بہار معلوم ہوتا ہے ؎

ممکن ہے کہ میں جس کو سمجھتا ہوں بہاراں
اوروں کی نگاہوں میں وہ موسم ہو خزاں کا

آپ لوگوں کی تشریف آوری سے گلشن کا کچھ اور ہی رنگ ہے، ویسے یہی چمنستان علم خزاں نا آشنا ہوتے ہیں۔

گرامی قدر مولانا اکبرآبادی صاحب! میں آپ کا تہِ دل سے ممنون ہوں کہ آپ اپنی بے حد مصروفیات کے باوجود یہاں تشریف لائے، ہم چھوٹوں کی دعوت پر جامعہ میں آپ کی تشریف آوری بلاشبہ ہماری حوصلہ افزائی اور کنونشن کی بہترین کامیابی ہے ہم آپ کا دل کی بے انتہا گہرائیوں سے استقبال کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں، آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہ شبلی و فراہی کی سرزمین ہے، عبد الرحمٰن مبارک پوری، اقبال سہیل اور عبد السلام ندوی جیسی نامور ہستیوں نے یہاں جنم لیا ہے، یہ ضلع ہمیشہ ادیبوں اور شاعروں کا مرکز رہا ہے، اسی کے ساتھ

یہاں علم دین کے کتنی ہی تشنہ جام اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں یہ اور درس گاہ کی روشنی کچھ زیادہ ہی تابناک ہے۔

جناب عالی! آپ کا شمار ہندوستان کے چند اہم اہل قلم میں ہوتا ہے، آپ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لائق پروفیسر، برہان جیسے موقر جریدہ کے ایڈیٹر اور کئی وقیع کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ الفاروق کے بعد لوگوں کی نگاہیں الصدیق کو تلاش کر رہی تھیں، چنانچہ آپ کی شاہکار کتاب "صدیق اکبر" نے اس کمی کو پورا کر دیا، ان حیثیتوں سے آپ ہمارے لئے بزرگ محترم ہیں، اس کے علاوہ بھی آپ کی ایک امتیازی حیثیت ہے جس کی وجہ سے ہم آپ کو پیارے مولانا سے مخاطب کرنے کی جرأت کر رہے ہیں، وہ یہ کہ آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء عظیم درس گاہ کے ابنائے قدیم طالب علم ہیں اور یہ کشمکش بھی اسی کے طلبہ قدیم کی ہے۔

اس لئے ہم طلبہ قدیم آپ کو اپنی برادری کا ایک سینیر (Senior) تصور کرتے ہیں۔

محترم! ہندوستان میں مختلف اداروں نے مختلف پہلوؤں سے دین و ملت کی خدمت کی، دارالعلوم دیوبند نے دعوت و تبلیغ، اشاعت علوم دینیہ اور رد بدعات کو اپنا مقصد بنایا اور اس مقصد میں کامیاب بھی رہا، ندوۃ العلماء بقول اکبر الٰہ آبادی زبان ہوش مند بن کر رہا، اس نے میدان ادب و تاریخ میں ماہرین اور رجال پیدا کئے، اسکا آئیڈیل بھی یہی تھا، مسلم یونیورسٹی کا آئیڈیل علوم جدیدہ میں ماہرین تیار کرنا تھا، جو موجودہ نظام کی مشنری میں آسانی سے فٹ ہو سکیں، چنانچہ مسلمانوں کو علمی زبوں حالی اور پستی سے نکالنے اور علمی میدان میں آگے بڑھانے میں اس نے نمایاں رول ادا کیا، مدرسۃ الاصلاح نے تحریک اسلامی کو کئی لائق کارکن دئے اور ایک خاص فکر دے، صحیح تفسیر کا علمبردار بنایا۔

جناب عالی! یہ ادارہ جہاں میں آپ بحیثیت مقدم کر رہا ہوں ملت کے نوجوانوں کو شاہین صفت بنانے، ملت کی نمود نو، فلسفہ خودی کو طلبہ کا شیوۂ زندگی بنانے اور احیائے اسلام کیلئے ان کے اندر جذبۂ بیتابی پیدا کرنے کی دراصل ایک تحریک اور مشن ہے۔ ہم آپ کے وسیع تجربات کی روشنی میں دوسرے بزرگوں اور معزز مہمانوں کی موجودگی میں اپنے اس مشن کی تکمیل کا عزم کرنا چاہتے ہیں۔

مہمانان کرام! ہم سراپا سپاس ہیں کہ آپ نے ہمارے لئے اس طویل سفر کی زحمتیں برداشت کیں اور اپنے قیمتی اوقات کو قربان کیا، ہم آپ کے لئے محبت و عقیدت سے تڑپتا ہوا دل رکھتے ہیں، ہمیں امید ہے کہ یہ مختصر سی صحبت قربت کی یہ چند ساعتیں، سالوں کے لئے ہمارے اندر حوصلہ و امنگ پیدا کرنے کے لئے کافی ہوں گی، ہمارے دلوں میں اپنے محترم اور بزرگ مہمانوں، پروفیسر محسن صاحب پرنسپل شبلی کالج، ابوالمجاہد زاہد صاحب، الحفیظ میرٹھی صاحب، سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب ناظم دارالمصنفین، اجمل اصلاحی صاحب اور دوسرے معززین شہر و قصبہ کیلئے بڑا احترام ہے اور ہم اسے اپنا قیمتی سرمایۂ حیات تصور کرتے ہیں۔

محترم تسلیم سیمابی صاحب آپکے جذبات بجد سنجیدہ، جوان اور راست ہیں، کہ میں بجد قدر کرتا ہوں، موصوف نے کشمکش کی تیاری میں اپنے قیمتی مشوروں اور مفید تحریروں سے حوصلوں کو گرمایا ہے جس کی وجہ سے ہم اس لائق ہو سکے، ہم چاہتے ہیں کہ تنگ نظری اور گھٹن کی فضا سے نکل کر تمام نوجوان تحریک اسلامی کے کل پرزے بن جائیں، اس سلسلے میں آپ کے جذبات اور گرانقدر مشورے ہمارے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے ہمیں کسب فیض کا موقع دیا، اس کے لئے آپ کا بیحد شکریہ!

برادر گرامی احمد اللہ صدیقی صاحب! آپ کے لئے میرا دل محبت بجد شدید ہے، مجھے آپ سے انتہائی جذباتی

اور والہانہ عقیدت ہے، آپ اس کفر و الحاد کے دور میں ان مسلم نوجوانوں کا دھڑکتا ہوا دل ہیں، جو تحریک اسلامی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔

احمد اللہ بھائی! ہم اپنی درسگاہ بلکہ تحریک اسلامی کی اس سرزمین پر ایسے وقت میں آپ کا خیر مقدم کر رہے ہیں جب دنیا کی تمام طاقتیں اسلام کی حقانیت اور اس کی سچائی سے بری طرح بوکھلائی ہوئی اسے مٹا دینے کے درپے ہیں، گو کہ - ع

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

مجھے کہنے دیجئے کہ اسلام کی پوزیشن اب چودھویں صدی کے وسط تک کی نہیں رہ گئی ہے، بلکہ آپ ہی جیسے جوان سال حوصلہ مند ملت کے نونہالوں کی کوششوں نے اسلام کو اقدامی پوزیشن میں لا کھڑا کیا ہے، اب انہیں دادرسی کی ضرورت نہیں، بلکہ فخر کے ساتھ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہماری پناہ و رہنمائی کی ضرورت دوسروں کو ہے۔

برادر گرامی میں ایسے وقت میں آپ کا استقبال کر رہا ہوں جب اسلامی تحریکیں کامیابی کے ساتھ ملک کے اور گرد دنیا کے طول و عرض میں سیل رواں کی طرح طاغوتی قلعوں کو مسمار کر رہی ہیں، ایران، پاکستان اور افغانستان کے مجاہد نوجوانوں نے جو کردار ادا کیا ہے، اس سے بھی بڑھ کر آپ سے توقعات ہیں، خدا کرے ہماری یہ مختصر سی ملاقات آپ ہی کا جذبہ و ولولہ ہم میں بھی پیدا کر دے، ہمارے دل، علم، توانائیاں اور تمنائیں اسلام کو غالب کرنے کے لئے آپ کے ساتھ ہیں۔

محترم اساتذہ کرام، ناظم صاحب و ذمہ داران مجلس! ہم یہاں آپ کا استقبال کرنے آپ کو مرحبا کہنے نہیں آئے ہیں، ملک کے طول و عرض سے اپنی مصروفیات کو تج کر کے صرف آپ کو سلام کرنے آئے ہیں، مادر درسگاہ سے عقیدت و محبت کا اظہار کرنے اور آپ کی شفقتوں سے چند ساعتوں ہی کے لئے سہی، استفادہ کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ ہم یہاں اس لئے آئے ہیں کہ آپ کی محبتوں کے جواب میں اپنی عقیدت و احترام کی نذر آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں، ہم آپ کے بیٹے ہیں، اپنی کمائی کا حساب دینے آئے ہیں، ہم اپنے کو آپ کے سامنے اس لئے پیش کرنے آئے ہیں کہ آپ نے ہم سے جو توقعات وابستہ کر رکھی ہیں، ہم نے انہیں کس حد تک پورا کیا، کہیں آپ کی محنتیں، دن رات کی کاوشیں اور بے پناہ خیال جو آپ نے ذہنی اور روحانی پرورش کے لئے اٹھائیں، رائیگاں تو نہیں گئیں، آپ یقین فرمائیں کہ سیکڑوں میل کی دوری پر رہتے ہوئے بھی ایک لمحہ کے لئے ہم آپ کو، اپنی درسگاہ کو، یہاں کی صبح و شام کو اپنے ذہن سے محو نہ کر سکے۔ جب بھی مادر درسگاہ کا تذکرہ آیا ہے، یا کوئی آپ لوگوں کی خیریت سے آگاہ کرتا ہے تو اکثر ہم جذباتی ہو جاتے ہیں، ہماری کیفیت بالکل وہی ہوتی ہے جو کہ پردیس میں وطن کے کسی آدمی سے - ایک پردیسی کی ہوتی ہے، ہم کبھی آپ کے احسانات اور بے پایاں شفقتوں کو فراموش نہیں کر سکتے، آپ کی یادیں اور باتیں زندگی کا بہترین سرمایہ ہیں۔

عزیز و کرم ہم نفسو، ہم صفیرو! میں آپ کا ہوں اور آپ ہی کی مادر علمی میں آپ کا خیر مقدم کر رہا ہوں، آپ لوگوں نے میرے ناتواں کندھوں پر کنونشن کے نظم کا بار ڈالا تھا، اور آپ ہی لوگوں کے گراں قدر مشوروں اور عملی و مالی تعاون اس سے بخوبی عہدہ برآ ہونے میں میرے معاون ہوئے میں اس میں کامیاب ہوں یا ناکام، اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے، بہرحال میں صرف اتنا کہوں گا کہ دنیا کی تاریخ میں شاید طلبہ قدیم کی انجمنوں (Old boys association) کا یہ انداز نہیں ہے جو آپ لوگوں نے باہم مشوروں سے اپنایا ہے، یہ ہماری خوش نصیبی ہے، اور ہمیں اس پر فخر ہے

کہ ہم سال دو سال میں اپنی مصروفیات کا ایک حصہ اپنے اساتذہ سے نیاز حاصل کرنے، مادرِ علمی کی زیارت اور اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں سے ملنے کو بھی سمجھتے ہیں۔

ہمارا آپ کا یہ اجتماع کسی دنیوی غرض، یا روایتی اور دستوری تعلق کے سبب نہیں ہوا ہے، ہم صرف اپنے بھائیوں سے خلوص و محبت کے ساتھ ملنے جمع ہوئے ہیں ہمارے اندر بے پناہ جذبہ ہے، اپنی مادرِ درسگاہ کو اونچا دیکھنے کا، ہم اس کی تعمیر و ترقی کے لئے خلوص دل سے فکرمند ہیں، ہم اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں، ہم سے اساتذہ اور درسگاہ کے کیا مطالبات ہیں، اسے پورا کرنے کی سعی و جہد کرنے کے لئے اکٹھا ہوئے ہیں، عہدِ طالب علمی گذر گیا، مگر اسکی یادوں کو ہم خواب و خیال نہ بننے دیں گے۔

میرے محترم اور عزیز ساتھیو! آپ نے جس جوش و خروش اور اتحاد و یکجہتی کا مظاہرہ کیا ہے یہ تابناک مستقبل اور مقصدِ زندگی میں نمایاں کامیابی کی ضمانت ہے، اتحاد معجزاتی قوت کا دوسرا نام ہے، اتحاد و اخلاص مقصد سے سچی لگن کمزور گروہوں کو فاتح بنا دیتا ہے، قوموں کے عروج و زوال پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اتحاد کی اجتماعی زندگی میں کیا اہمیت ہے۔

دوستو اور محترم بھائیو! ہم آپ کے جذبہ خلوص کی قدر کرتے ہیں، مقصدِ زندگی کی کامیابی و ناکامی کا انحصار اسی عشق و محبت کی کمی بیشی پر منحصر ہے، میں مانتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک اسلام کا بول بالا اور آخرت کی حکومت اس سرزمین پر دیکھنا چاہتا ہے، لیکن اس کے لئے کسی تصور کے نقشے میں اپنی انفرادی و اجتماعی زندگیوں کو ڈھالنے کی ضرورت ہے تاریخ آپ ہی جیسے اولوالعزم اور حوصلہ مند انسانوں کا انتظار کرتی ہے۔

دوستو! تحریکِ اسلامی کی راہ پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں بھرا خارزار گذار راستہ ہے جس سے آپ کو بار بار صبر و ضبط اور ہمت، جانی کے ساتھ گذرنا ہے ؎

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

آپ جس طرح حوصلوں اور امنگوں کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں، بڑھتے رہئے۔ درماندگی و مایوسی شیوۂ مومن نہیں ؎

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُردم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

برادرانِ اسلام! مجھے آپ اجازت دیں تو میں جرأت کروں کہ یہاں رہ کر ہی مادرِ علمی کی خدمت نہیں ہوتی، بلکہ ملک کے طول و عرض میں آپ کا آئیڈیل کردار، علمی مرتبت اور نیک نامی ہی جامعہ کی حقیقی خدمت ہے۔

آخر میں ایک بار پھر میں تمام مہمانانِ گرامی اور اساتذۂ کرام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی جانب سے صدر و سکریٹری انجمن اور تمام ارکانِ انجمن اور طلبہ برادری کی جانب سے تہنیت بھرا دل اور پُر احترام جذبات نذر کرتا ہوں اور میں ان تمام لوگوں کا بیحد مشکور ہوں جن کی کاوشیں اور مشورے مجھے اس لائق بنا سکے۔ والسلام

اظہر ریحان فلاحی (ناظم اجتماع)

(بقیہ "قرآن کا اقتصادی مطالعہ"، ص ۱۵ سے آگے)

حضرت عمر بن عبد العزیز نے خلافت کا جو شاندار مظاہرہ کیا، باطل روایات، جاگیریں، ناجائز ملکیت سب کو یکلخت جس طرح مٹا دیا اور ایک مثالی حکومت قائم کی، حضرت خالد بن ولید معزولی کا پروانہ پاکر ایک عام سپاہی کی حیثیت میں جس جاں فروشی کے ساتھ لڑے اور اطاعت و انقیاد اور کامل سپردگی و جاں نثاری کا جو شاندار ریکارڈ قائم کیا۔ کوئی بتائے کہ اس میں کون سا جبر کارفرما تھا؟ کس نے انھیں اس پر مجبور کیا تھا۔ (ڈائری کی تابناک مثالیں - ۱۵ جولائی)

نظریۂ فرائڈ کا تقابلی مطالعہ

نظریۂ فرائڈ کی خامیاں

ماہرین نفسیات نے نظریہ فرائڈ کی بہت سی خامیاں اور کمزوریاں بیان کی ہیں، حتیٰ کہ فرائڈ کی نفسیات کا تجزیہ کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ خود جنسی خواہشات کا غلام تھا اس لئے ہر چیز کو وہ جنسیت ہی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ فرائڈ نے لاشعور میں تمام تر جنسی نوعیت ہی کی کارفرمائیوں کو تسلیم کیا ہے، اگر ہم اسے درست قرار دے لیں تو پھر تو جنسی خواہشات کی تکمیل سے کامل انشراح اور آسودگی حاصل ہونی چاہئے۔ حالانکہ تجربہ اس کے برخلاف ہو رہا ہے، امریکہ میں بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ روی کی کوئی انتہا نظر نہیں آتی، اب عورتوں سے جنسی خواہشات کی تکمیل کرنے کے بجائے مردوں اور بچوں سے کی جا رہی ہے، اور حسین بچوں کے قحبہ خانے کھل رہے ہیں، اور اس پر "ہل من مزید" کا نعرہ لگایا جا رہا ہے۔

فرائڈ کا یہ نظریہ بالکل ہی غلط ہے کہ آزادانہ میل جول خیالات کو مہذب بناتا ہے، دبی ہوئی طاقتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور دونوں فریق کو آداب معاشرت سکھاتا ہے، کھلی برہنگی مسلسل دیکھتے رہنے سے آدمی کی جنسی بھوک مٹ جاتی ہے جنسی خواہشات سرد پڑ جاتی ہیں اور اس طرح کامل تجربے کے بعد جو شریک زندگی کا انتخاب کیا جاتا ہے، وہ محبت، اخوت، باہمی انس اور تعلقات کی استواری کا کفیل ہوتا ہے۔

طویل تجربے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آزادانہ اختلاط کی بدولت خاوند یا بیوی کی زندگی میں کسی زیادہ طاقت ور، زیادہ حسین و جمیل اور جاذب شخصیت کا ابھر آنا عین ممکن ہوتا ہے اور پھر کسی ایک کے پھسل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اور اگر کوئی رشتۂ زوجیت کو بچانے کی خاطر وہ اس جذبے کا مقابلہ کرے تو اضطراب و بے چینی کا شکار ہو کر انتشار میں مبتلا ہو جاتا ہے، دونوں ہی صورتوں میں اطمینان قلب غارت، خاندانی اطمینان ختم اور خانگی امن برباد ہو جاتا ہے، پھر انسانیت کا بدکاری و بے حیائی میں ملوث ہو جانا، اور اخلاق و اقدار سے گر پڑنا اور حیوانی صفات سے اپنے کو مزین کرنا ستم بالائے ستم ہے۔

جہاں تک آزادانہ اختلاط سے فریقین کے درمیان محبت و شائستگی کے پیدا ہونے کا سوال ہے تو یہ بالکل ہی لغو ہے، اس کا نتیجہ سوائے ناجائز مباشرت اور اسقاط حمل کے اور کچھ نہیں ہوتا، انڈین انسٹی ٹیوٹ میڈیکل کے ایک جائزے کے مطابق اسپتالوں میں اسقاط حمل کرانے والوں میں ۵۰ فیصد کنواری لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ جائزہ کے مطابق حمل گرانے والوں میں بیشتر اسکولوں یا کالجوں کی پڑھنے والی طالبات ہوتی ہیں، جو تین سو روپے ماہوار سے چار سو روپے ماہوار تک آمدنی رکھنے والے خاندانوں سے متعلق ہوتی ہیں۔

امریکہ میں ہائی اسکولوں میں حاملہ لڑکیوں کی تعداد تو

چند سالوں تک یہ دم فیصد تک پہونچ چکی تھی اور اب دن بدن اس میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے، یہاں تک کہ مشہور مصنف جارج اسکاٹ اپنی تصنیف "قحبہ گری کی تاریخ" (The History of Prostitution) میں لکھتا ہے :-

"تاریخ عالم کے کسی دور میں آج سے پہلے معزز گھرانوں کی لڑکیوں کی اتنی کثیر تعداد جنسی خواہشات کی تسکین میں کبھی اتنی پیش پیش نہ تھی، یہ صورت حال امریکہ اور یورپ کے ہر شہر میں موجود ہے، جہاں لڑکیاں بہر وجوہ مردوں سے ازدواج کے بغیر اختلاط پیدا کرتی ہیں، آجکل نوجوان لڑکیاں اس وقت تک شادی کا خیال نہیں کرتیں جب تک وہ خوب گھوم پھر کر تھک نہیں جاتیں"

پروفیسر سارلن اپنی مشہور کتاب (Love and Marriage "محبت اور شادی") میں لکھتا ہے

"جنسی آزادگی نے دوشیزگی اور عفت مآبی کا قلع قمع کر دیا ہے، شادی سے قبل کسی لڑکی کا باکرہ رہنا اب ممکن ہی نہیں رہا، سوسائٹی میں خود اس چیز کی کوئی اہمیت نہ رہی"

جدید دنیا میں آزادانہ میل جول اور کامل تجربے کے بعد نکاح کرنے والے خوش قسمت گھرانوں سے یہ بھی دریافت کرنا چاہئے کہ ان میں سے طلاق سے برباد ہونے والوں کا تناسب کیا ہے؟ قومی آواز کی ۱۳ اگست ۱۹۸۶ء کی رپورٹ کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ طلاقیں دنیا کے سب سے زیادہ جدید اور مہذب ملک امریکہ میں دی جاتی ہے، ۱۹۸۴ء میں امریکہ میں ایک ملین پچیس ہزار طلاق لینے یا دینے کے واقعات ہوئے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ہزار آبادی پر ۴.۹ افراد وہاں طلاق شدہ ہیں، امریکہ کے بعد ایک امریکی تہذیب کے پروردہ ملک کا نمبر (۲) ہے، جہاں ۲.۳ فی ہزار طلاق ہوتی ہے، سویڈن ڈنمارک روس، اسٹونیا، ... اور مغربی جرمنی و مشرقی جرمنی کا نمبر بعد میں آتا ہے ۔

۱۰ / اکتوبر ۱۹۷۷ء کو برطانوی ہائی کورٹ کے جج مسٹر جانج بیکر نے خاتون سوسائٹی میں کہا کہ میرا اندازہ ہے کہ اس سال ایک لاکھ اسی ہزار طلاقیں ہوں گی، یعنی ہر دو شادیوں میں سے ایک کا انجام طلاق ہوگا ۔

یہ تو طلاق یافتہ گھروں کا حال تھا، آزادانہ اختلاط سے بے قید شہوتوں، صبح شام بدلنے والی خواہشات اور باطنی قلق و اضطراب کا ظہور ہوتا ہے، اس معاشرے میں ہر شریک رفیق حیات یا جیون ساتھی یا بوائے فرینڈ ان شہوتوں کو بھڑکا سکتا ہے، اور نتیجۃً مرد اور عورتیں دونوں ہر نئے شکار کے ساتھ کھسک سکتی ہیں، زوجین میں بجائے استواری اور استحکام پیدا ہونے کے انقطاع اور کمزوری اتصال پیدا ہو جاتا ہے، جب کوئی مرد یا عورت کسی نئی شخصیت میں کوئی نئی لچک دیکھتی ہے تو خانگی زندگی آندھیوں کی زد میں آجاتی ہے، اور دونوں میں دائمی تفریق ہو جاتی ہے، اسی سلسلہ کی مغربی جرمنی کی ایک دلچسپ خبر یہ ہے کہ ایک آفس منیجر، آفس کی چابی گھر بھول گیا چابی لینے وہ گھر پہونچا تو اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اس کے گھر کی کھڑکیاں ابھی تک بند پڑی تھیں، وہ دروازے سے گذرتا ہوا باورچی خانے پہونچا، تو اس نے دیکھا کہ اس کی ۲۶ سالہ حسین تر بیوی پوری طرح برہنہ، انڈے اور مچھلیاں تل رہی ہے اور اس کے پاس ہی ایک نوجوان بھی ٹھیک اسی حالت میں برہنہ اسٹول پر بیٹھا ہے، یہ منظر دیکھ کر وہ مشتعل ہوگیا اور غصہ میں اس نے اپنی بیوی کو اٹھا کر اس فرائی پان میں بٹھا دیا جس میں انڈے تلے جا رہے تھے، اس نوجوان کو وہاں سے بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا، مزید تماشا یہ کہ پولیس نے شوہر پر یہ الزام لگایا کہ اس نے اپنی بیوی کو سخت جسمانی تکلیف پہونچائی ہے۔

تہذیب جدید کا یہ تجربہ قرآن کی کھلی تکذیب کرتا ہے وہ ارباب عقل و فکر کو چیخ چیخ کر بتا رہا ہے کہ اختلاط مرد و زن کا نتیجہ صرف دائمی انتقال ہے، تم اس سے محبت و اخوت

باہمی تعامل و تعاون، جنسی بھوک کو دبا دینے اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے فوائد حاصل نہیں کر سکتے، جسمانی خواہشات اتنی گہری ہوتی ہیں کہ اختلاط مرد و زن بلکہ فریقین کے باہم سیر ہو جانے کی آزادی بھی انھیں نہیں بجھا سکتی۔ تم معدے کی بھوک کو صرف بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سے نہیں مٹا سکتے، بلکہ وہ بھوک کی شدت میں اور اضافہ کر دیتی ہے، اسی طرح تم اسے بدہضمی پیدا کرنے والی مرغن غذاؤں سے بھی صرف ایک محدود مدت تک ہی مٹا سکو گے اس کے بعد جب دوبارہ اس کی طلب ہو گی تو پہلی طلب سے شدید تر ہو گی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعلان تجربات بیانگ دہل کر رہے ہیں۔

پھر اس نظریہ کو صحیح تسلیم کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ بچہ کا انگوٹھا چوسنا، چیزوں کو کاٹنا، منہ میں رکھنا، پاخانہ پیشاب کرنا، چیزوں کی طرف دیکھنا، منہ پھیر لینا، ٹانگوں اور ہاتھوں کی حرکات وغیرہ سب میں جنسی جذبہ کی کارفرمائی مان لی جائے۔

پھر یہ بھی سوچئے کہ سماج کی خدمت کرنے والے رشی، ضلالت کو ختم کر کے ہدایت کی روشنی پھیلانے والے انبیاء و رسل، گمراہیوں کے خلاف سربکف مصلحین و اتقیاء اور قوم و ملت کی خاطر جان دینے والے شہداء، کیا ان سب کی کارگزاریاں محض جنسی جذبے کی انگیخت کا نتیجہ ہیں؟ کیا یہ بلند اخلاق و کردار کے مالک انسان محض جنسی خواہش کی تکمیل کا سامان کرتے رہے؟

پھر فرائڈ کہتا ہے کہ اخلاق پر سماجی اثرات بہرحال اہم ہوتے ہیں، اگر اس نظریہ کو درست مان لیا جائے تو آنحضور صحابۂ کرامؓ کے ایمان لانے کے زہرہ گداز واقعات، جاں گسل مصائب و مشکلات پر ان کا صبر اور دین کی خاطر ان کی جد و جہد کی کیا تاویل کی جائے گی؟ اس وقت جبکہ آنحضورؐ کی دعوت پھیلی بھی نہیں تھی، کوئی ان کی دعوت کا ہم نوا نہ تھا، آپ کے پیچھے کسی قسم کی سیاسی و دینی سیادت کی قوت نہ تھی، صحابۂ کرام آپ پر ایمان لائے اور تن من دھن سے اس کی اشاعت میں لگ گئے، تمام مصائب کو خود ہی دعوت دی، اور حوادث کے تھپیڑے کھا کر بھی دین پر ثابت قدم رہے۔ آخر صحابہؓ کے اس فعل میں کس قسم کے جبر کو دخل تھا؟ کون انھیں ایمان لانے اور مصائب کو دعوت دینے پر مجبور کر رہا تھا؟

حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اپنے خطبہ میں بیان فرمایا تھا:-

یاایها الناس انی قد ولیت امرکم ولست بخیرکم وان اقواکم عندی الضعیف حتی آخذ له بحقه وان اضعفکم عندی القوی حتی آخذ منه یاایها الناس ما انا الا کاحدکم فاذا رأیتمونی قد استقمت فاتبعونی وان زغت فقوّمونی۔

لوگو! مجھے تمھاری حکومت کا کام سونپا گیا ہے، حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں، میرے نزدیک ضعیف آدمی تم میں سب سے زیادہ قوی ہے جب تک کہ اس کا حق اسے نہ دلوا دوں، اور قوی آدمی تم میں سب سے زیادہ ضعیف ہے جب تک کہ اس سے حق وصول نہ کر لوں، لوگو! میری حیثیت تمھارے ایک معمولی فرد سے زیادہ نہیں ہے، اگر تم مجھے سیدھی راہ چلتے دیکھو تو میری پیروی کرو اور اگر دیکھو کہ میں کج رو ہو گیا ہوں تو مجھے سیدھا کر دو۔

خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ اپنے ایک خطبہ میں اپنے منصب کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:-

انما انا ومالکم کولی الیتیم، ان استغنیت استعففت وان افتقرت اکلت بالمعروف، لکم علیّ ایها الناس خصال فخذونی بها، لکم علیّ ان لا اجتبی شیئاً من خراجکم ولا مما افاء الله علیکم الا من وجهه، ولکم علیّ اذا وقع فی یدی ان لا یخرج منی الا فی حقه۔ تمھارے مال سے میرا تعلق وہی ہے جو یتیم کے مال سے اس کے ولی کا ہوتا ہے، اگر میں خوشحال ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا اور اگر تنگ دست ہوں گا تو بقدر جائز حق خدمت ہو گا وہ لے لوں گا۔ میرے اوپر تمھارے کچھ حقوق ہیں، اور تم ان کا مجھ سے مطالبہ کر سکتے ہو، منجملہ ان کے یہ فرض ہے کہ تم سے خراج کی مدمیں اور جو اللہ نے تمھیں فے میں عطا فرمایا ہے کوئی

[illegible]

عبدالمجیب ، مدینہ منورہ

مقامِ مودودیؒ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو اللہ کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے ہم سے رخصت ہو گئے ۔ اپنے سر سے ایک محقق اور مجیب رہنما و رہبر کا سایہ کیا اٹھا ، قیامت صغریٰ گزر گئی ۔ عجیب اور خلاف معمول بات ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے ، توں توں دل و دماغ کا گداز گہرا ہوتا جا رہا ہے ، اب تک آنکھیں لہو لہو ہیں اور جگر لخت لخت ۔ ہم صدمے سے نڈھال ہیں [illegible] ، مرشدی و مولائی مودودیؒ سے میری [illegible] سالہ نیاز مندی کا تقاضا ہے کہ میں بھی نذرانۂ محبت و عقیدت پیش کروں ، لیکن سوچتا ہوں کیسے کروں ۔ کہاں میں اور کہاں وہ کہ جو خاک پائے خاتم الانبیاء [illegible] دعویٰ امام الوقت بھی تھا ، یعنی یہ کہ اس جہاں کا امام العصر تھا ۔ اللہ اکبر ! آج میرا قلم میرے احساسات کا ساتھ دینے سے عاجز معلوم ہو رہا ہے ۔

امام مودودی رحمۃ اللہ علیہ پر قلم حق ادا کر سکے ، یہ مشکل ہی نہیں ، ناممکن ہے ۔ وہ عظیم ہستی تو ایک ایسی ہمہ گیر ، ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت تھی کہ اس کا احاطہ ممکن نہیں ہے ۔ وہ مفکر تھا اور مرد مومن جو بیک وقت مفسر بھی تھا اور محدث بھی ، محقق بھی تھا اور مورخ بھی ، مدبر بھی تھا اور متکلم بھی ، معلم بھی تھا اور مبلغ بھی ، مصلح بھی تھا اور مجاہد بھی ، مجتہد بھی تھا اور مجدد بھی ۔ [illegible]

امام مودودیؒ کہ جن سے ایک عالم سیراب ہوا ، [illegible] اخلاص تھے ، مجموعۂ اخلاق تھے ، محیط علم تھے ، مرقع عمل تھے ، مقتدر دار تھے ، مالک شخصیت تھے ، [illegible] دین و دانش تھے اور سوانح گفتار و کردار تھے ، پھر یہ وہ مجسم شجاعت تھے اور مہر استقامت تھے ، مزاحم طاغوت تھے اور مانع منکرات تھے ، مثال عزیمت تھے اور مقصود انسانیت تھے ، مقتضائے مشیت تھے اور مقصد حیات تھے ــــ وہ کہ جو فی الواقع مظہر اشرافت تھے ، مخزن اسلاف تھے ، مسلک شیخین تھے ، [illegible] تھے ، محافظ شریعت تھے ، مرکز ہدایت تھے ، مشعل امت تھے ، محسن ملت تھے ، منہاج فکر و نظر تھے ، منبع خیر و ثمر تھے ، ماہ منیر تھے ، منارۂ نور تھے ، منفرد تاریخ ساز تھے ، ممتاز سوز و آواز تھے ۔ موجب ایمان و ایقان تھے ، مرجع خاص و عام تھے اور یہ کہ وہ حقیقتاً مایۂ حب اللہ تھے ، مانند حزب اللہ تھے ۔ الغرض امام موصوف محور اسلام بھی تھے اور محتسب باطل بھی ، معجز داعی اعلیٰ بھی تھے اور مستحق اقدار اعلیٰ بھی ، منتسب انبیاء بھی تھے اور مخدوم اولیاء بھی ، مزاج شناس رسول بھی تھے اور میر کارواں بھی ، سچ تو یہ ہے کہ امام مودودیؒ مسیحائے دوراں بھی تھے اور مہدی زماں بھی ۔ آہ ! وہ مثالی و معیاری مسلم کہ جس پر خود اسلام کو ناز تھا ، ناز ہے اور ناز رہے گا ! سبحان اللہ !!

امام مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق میں کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع تام تھے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع کامل تھے، کشتیٔ عالم اسلام کے ملاح خاص تھے، خیر کے ملجا و ماویٰ تھے اور عصر اولیاء و علمائے کے مرشد عام تھے، مختصراً یہ کہ وہ امام الوقت تھے، امام العصر تھے، میں شہادت دیتا ہوں اور ان شاء اللہ روز آخرت بھی شہادت دوں گا کہ مولانا مودودی نے دین حق اور اعلائے کلمۃ الحق کا پورا پورا حق ادا کر دیا، لہٰذا میں بالیقین کہتا ہوں کہ وہ اس مقام عالی پر فائز ہو چکے ہیں، جہاں ان کو حاصل ہے اپنے رب کی رحمت بھی اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کی قربت بھی۔

واللہ! میں صاف دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے امام سید ابوالاعلیٰ مودودی پر نور السمٰوات والارض کے نور کی ہر طرف سے بارش ہو رہی ہے۔ اللّٰھم زد فزد!

بقیہ ہندوستان میں سگریٹ نوشی صلا سے آگے

کا تعلق سماجی مقام، وقار بلکہ مردانگی سے ہے، یہ خیال ان مغرب زدہ نوجوانوں کا ہے، جنہوں نے مغرب زدہ گھروں میں تربیت پائی ہے، انگریزی پڑھی ہے اور جو مغربی معاشرے اور اس کے طور طریقوں پر فریفتہ اور ہالی ووڈ اور اس کے ہیروؤں کے عاشق ہیں، کالج کے اکثر لڑکوں کے باپ بھی سگریٹ پیتے ہیں، دوسرے نوجوان محض دوستوں کے اصرار پر اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔

سگریٹ نوشی کے سلسلے میں ہندوستانی معاشرہ کا رویہ اسے قبول و گوارا کر لینے کی حد تک روادارانہ ہے، یہ معاشرہ اسے زیادہ سے زیادہ ایک غیر ضروری عادت قرار دیتا ہے اور اس عادت کو ایک سماجی لعنت قرار دینے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ہندوستانی حکومت کا رویہ کیا ہے؟ اس معاملے میں اس کا رویہ بھی دنیا کی دوسری حکومتوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، اس سلسلے میں اس کی وفاداریاں بھی متضاد ہیں، آمدنی اور صحت عامہ کے معاملے میں مصلحت بینی سے کام لیا جاتا ہے، مثلاً ہندوستانی حکومت کے ڈائرکٹریٹ آف ٹوبیکو ڈیولپمنٹ نے اپنی ایک اشاعت کے پیش لفظ میں لکھا ہے:-

"ہندوستان کا فی کس تمباکو کا استعمال ترقی یافتہ ملکوں مثلاً امریکہ، کنیڈا، آسٹریلیا، سوئزرلینڈ، جاپان، برطانیہ اور مغربی جرمنی کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس لئے ملک میں تمباکو کے فروغ کی بڑی گنجائش ہے" تمباکو نوشی کی مضرت سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے سلسلے میں حکومت نے ابتک صرف یہی کیا ہے کہ تمباکو سے تیار ہونے والی اشیاء کے اشتہاروں اور ڈبوں پر یہ تحریر کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے کہ سگریٹ نوشی مضر صحت ہے۔

ہندوستان میں سگریٹ نوشی کی مضرت کے بارے میں خاموشی کی بڑی گمبھیر ہے۔ تمباکو کی اشیاء کی خوب تشہیر کی جاتی ہے اور عوام کو ان کے ذریعے یقین دلایا جاتا ہے کہ انہیں معاشرے میں اس کی وجہ سے بڑی کامیابیاں نصیب ہوں گی۔ سگریٹ بنانے والی کمپنیاں مقابلے اور کھیلوں کا انتظام کر کے لوگوں کو متوجہ کرتی ہیں، مگر سگریٹ نوشی کی مضرت کے بارے میں معدودے چند مضامین کے باوجود لوگوں کی اکثریت اس سلسلے میں شک و شبہ کا شکار ہے اگر با اثر افراد اس کے خلاف کوئی موثر تحریک چلائیں تو کم از کم نوجوانوں کی اکثریت اس کا اثر ضرور قبول کرے گی، مگر معاشرے کے کسی بھی طبقے کی جانب سے ایسی تحریک کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔

کیا ترقی پذیر ملکوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ترقی یافتہ ملکوں کی تحقیقات سے واقفیت کے لئے اور تمباکو نوشی کی مضرت کے بارے میں حاصل کردہ معلومات کیلئے خود ان ملکوں ہی کا سفر کریں؟ ترقی یافتہ ملکوں کے تجربات نے اگر اسے ہلاکت خیز قرار دے دیا ہے تو پھر تمباکو نوشی کے بارے میں ترقی پذیر ملکوں کی پالیسیوں پر ان کا اثر کیوں نہیں پڑتا؟

محمد عبدالسلام بستوی
جے آئی اسکول دو محلہ روڈ
رامپور — ۲۴۴۹۰۱

ابوالمجاہد زاہد
مرسلہ:- عبدالسلام فلاحی
اسلامک پبلشرز، رامپور

برادر محترم! اسلام مسنون

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ محترم ابوالمجاہد زاہد صاحب کی تازہ اور غیر مطبوعہ غزل ارسال خدمت ہے جو حیات نو کے لئے کہی گئی ہے، دوسری نظم جس کا تقاضا میں مستقل زاہد صاحب سے کر رہا ہوں، وہ افغانستان کے مجاہدین کو ولولۂ تازہ دینے والی ہوگی — انقلابی نظم — خدا کرے زاہد صاحب وہ نظم کہہ ڈالیں تو ان شاء اللہ دل کو گرما دینے والی کامیاب نظم ہوگی۔

الحمد للہ! "حیات نو" دن بدن ترقی کی طرف گامزن ہے، زیادہ طویل مضامین کے بجائے تنوع کی خاطر چھوٹے مضامین کو جگہ دیجیے" — الا یہ کہ مضمون خود ہی پرکشش ہو۔ "باقی آئندہ" کا سلسلہ بھی کم سے کم رکھئے۔ بلکہ ہر حصہ کو نئے عنوان سے شامل اشاعت کیجیے، گٹ اپ کا معیار کچھ اور بلند ہونا چاہیے۔ نہ بہت بھڑکدار نہ بالکل پھیکا — ٹائیٹل کور اگر رنگین ہو تو یک رنگی طباعت سے ٹائیٹل خود ہی دو رنگا ہو جاتا ہے "حیات نو" کا خط رقعی میں بلاک بنوالیں تو بہت عمدہ رہے گا — یہ حروف تہجی کی پہیلی نہ آتی تو بہتر ہوتا، ٹائیٹل پر کوئی نہ کوئی پرزور عبارت ضرور دیتے رہیں، اس سے خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے لیکن عبارت کم ہو، بہت زیادہ نہ ہو۔ والسلام۔

طالب خیر و دعا:- محمد عبدالسلام بستوی

غزل

دیکھ یوں رسوائی ایمان نہ کر
جان پر ایمان کو قربان نہ کر

رہ ہمیشہ تابع فرمان دیں
دیں کو اپنا تابع فرمان نہ کر

یا تو احساں کر کے احساں مت جتا
یا کسی انساں پہ احساں نہ کر

اس بت کافر کے دشنام پر نہ جا
اعتبار دشمن ایماں نہ کر

زندگی ہے اضطراب آرزو
زندگی کو بحر بے طوفاں نہ کر

ساز و ساماں کیا ہے راہ عشق میں
جان بھی جائے تو فکر جاں نہ کر

دست عثماں سے بھی تلاوت کا ثبوت
نا سمجھ ناقدری قرآں نہ کر

دل کو رکھ آباد ذکر اللہ سے
دل کو زاہد خانۂ ویراں نہ کر

تحریر:- عبدالقادر عودہ شہیدؒ

ترجمانی:- شفیق عالم فلاحی

شریعتِ اسلامی — مکمل شریعت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ

(البقرہ :- ۸۵)

(کیا تم کتاب کے بعض اجزاء پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو، تو تم میں سے جو ایسا کرے، اس کا اس کے سوا کیا بدلہ ہوگا کہ اسے دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو، اور قیامت کے دن ایسے لوگ سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔)

شریعت کے بعض اجزاء پر عمل کرنے اور بعض کو چھوڑ دینے کی حرمت کے سلسلے میں بہت سی نصوص وارد ہوئی ہیں، مثلاً :-

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝

(البقرہ: ۱۵۹ — ۱۶۰)

(بےشک وہ لوگ جو ہماری اتاری ہوئی واضح تعلیمات اور ہدایت کو جبکہ ہم نے اسے لوگوں کے لئے کتاب (قرآن مجید) میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے، ان پر اللہ تعالیٰ اور لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے، مگر وہ لوگ جنھوں نے توبہ کی، نیک عمل کئے اور کھول کھول کر بیان کر دیا تو میں ان کی توبہ قبول کروں گا، میں بہت بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہوں۔)

کتمان (حقیقت پر پردہ پوشی) بھی بعض احکام کو چھوڑ کر بعض پر عمل کرنے، بعض کا اقرار اور بعض کا انکار کرنے کے مترادف ہے، چنانچہ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝

(البقرہ: ۱۷۴ - ۱۷۵)

(بےشک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس چیز کو جو اللہ نے اتاری ہے کتاب میں سے اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت حاصل کرتے ہیں، وہ نہیں کھاتے ہیں اپنے پیٹوں میں مگر آگ، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ ان سے بات کرے گا نہ ہی انھیں پاک کرے گا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی اور

مغفرت کے بدلے عذاب کو خرید لیا۔ پس وہ کتنا صبر کرنے والے ہوں گے آگ پر۔)

مزید ارشاد ہے:-

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝ (مائدہ: ۴۴)

(پس تم لوگوں سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو، اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت نہ حاصل کرو، اور جو فیصلہ کرے اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا ہے تو ایسے لوگ کافر ہیں۔)

نیز:-

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۝

(نساء ۱۵۰-۱۵۱)

(بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کرنا چاہتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم بعض اجزاء پر ایمان لاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان سے کوئی راستہ نکال لیں، یہ لوگ حقیقت میں کافر ہیں۔)

اور:-

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ

وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ فَإِن تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُصِيبَهُم بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ۝ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۔

(مائدہ: ۴۸-۵۰)

(اور ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری، حق کے ساتھ درآنحالیکہ وہ تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے کتاب کی اور اس کی محافظ ہے، پس ان کے درمیان اسی کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے اتارا ہے، اور تمہارے پاس جو حق آیا ہے اس سے ہٹ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو، ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک ضابطہ اور طریقہ بنایا ہے اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنادیتا لیکن (وہ ایسا نہیں کرتا) تاکہ تمہیں جو کچھ دیا ہے، اس میں تمہیں آزمائے، پس بھلائیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو، اللہ ہی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے، پھر جس چیز میں تم ایک دوسرے سے جھگڑتے تھے تمہیں اچھی طرح باخبر کرے گا۔ اور (ہم تمہیں حکم دیتا ہے) کہ ان کے درمیان اسی کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے اتارا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو، اور ان سے اس بات سے ڈرو کہ اللہ نے جو کچھ تمہاری طرف اتارا ہے، اس کے بعض اجزاء سے تمہیں گمراہ نہ کردیں، اگر وہ روگردانی کریں تو جان لو کہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں کے بدلے انہیں مصیبت میں مبتلا کرے بلا شبہ بہت سے لوگ فاسق ہیں، کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ جو لوگ یقین رکھتے ہیں ان کے لئے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟

شریعت اسلامی ایک عالمگیر خدائی شریعت ہے

شریعت اسلامی اس اعتبار سے بھی ممتاز ہے کہ یہ ایک

عالم گیر خدائی شریعت ہے، جسے اللہ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس لئے اتارا ہے کہ آپ اسے تمام لوگوں تک پہونچا دیں ۔ خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی، مشرق کے باشندے ہوں یا مغرب کے، ان کے ذوق ایک دوسرے سے مختلف ہوں، ان کی عادتیں جدا جدا ہوں اور ان کے رسم و رواج اور تاریخ الگ الگ ہوں، یہ ہر خاندان، ہر جماعت اور ہر حکومت کی شریعت ہے۔ بلکہ یہ تو ایک ایسی عالمگیر شریعت ہے، جس کا ماہرین قانون صرف تخیل ہی کر سکے لیکن جسے نافذ نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ملاحظہ ہو:-

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا

(اعراف: ۱۵۸)

(اے نبی! کہہ دیجئے کہ لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔)

نیز:-

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ

(توبہ: ۳۳)

(وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے۔)

شریعت اسلامی ۔ ایک مکمل دائمی شریعت ہے

شریعت کا نزول اللہ تعالیٰ کی جانب سے مکمل اور جامع شریعت کی حیثیت سے ایک مختصر سی مدت میں پورا ہوا، جس کا آغاز پیارے نبی ﷺ کی بعثت سے اور اختتام آپ ﷺ کی وفات پر یا اس دن ہوا جب یہ آیت نازل ہوئی۔

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۔ (مائدہ: ۳)

(آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین منتخب کیا۔)

یہ آیت شریعت کے مکمل اور دائمی ہونے کے سلسلے میں بالکل واضح ہے، جبکہ شریعت کی نصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے کے سلسلے میں ایسی قطعی ہیں

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۔

(احزاب: ۴۰)

(محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔)

جو شخص بھی شریعت کے احکام کی جانچ پرکھ کرے گا وہ یہی پائے گا کہ یہ ایک مکمل شریعت ہے، یہ پرسنل لاء، آئین کے معاملات اور افراد سے متعلق تمام امور کو منظم کرنے کیلئے کافی ہے، یہ حکومت، انتظامی معاملات، سیاست اور ان کے علاوہ سوسائٹی کے دوسرے تعلقات کو بھی اسی طرح منظم کرتی ہے، جس طرح صلح و جنگ کے اوقات میں بین الملکی تعلقات کو۔

شریعت اسلامی کسی ایک وقت، ایک عہد، یا ایک زمانے کے لئے نہیں، بلکہ یہ تو ایسی شریعت ہے جو ہر وقت، ہر عہد اور ہر زمانے کے لئے کافی ہے، یہاں تک کہ زمین اور اس کی ساری موجودات کا مالک اللہ ہو جائے ۔ شرعی نصوص کی بنیاد بھی ایسی رکھی گئی ہے کہ نہ تو ان پر مرور ایام ہی کا کچھ اثر ہوگا نہ ہی ان کی جدت میں کمی آئیگی۔ اور نہ ان کے عام اصول و ضابطوں اور بنیادی نظریات میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی، ان میں اتنی عمومیت اور لچک ہے کہ ہر نئی حالت کے مطابق فیصلہ کر سکتی ہیں، اگرچہ بہت سے مقامات پر اسکی توقع بھی نہ کی جا سکتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نصوص شرعی کسی قسم کے تغیر اور تبدیلی کو قبول نہیں کر سکتیں جبکہ قانون کے نصوص میں تغیر اور تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

شریعت اور قانون کی ساخت کا موازنہ

گذشتہ صفحات سے ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ شریعت اسلامی کی ساخت کس طرح ہوئی، اور انسان کا وضع کردہ

قانون تو اس کا نشو و نما ایسی جماعت میں ہوتا ہے جو اسے ترتیب دیتی ہے اور جب یہ کمزور اور محدود اصول اور ضابطوں پر کھڑا ہوتا ہے تو اسے مضبوطی بخشتی ہے، پھر سوسائٹی کے انقلابات کے ساتھ اس میں تبدیلی واقع ہوتی ہے، اس کے اصول اور ضابطوں میں اضافہ ہوتا ہے، سوسائٹی کی حاجات و ضروریات میں اضافہ اور تنوع اور اس کے افکار و خیالات نیز علوم کی پیشرفت کے ساتھ ہی اس کے نظریات میں بھی بلندی آتی جاتی ہے، قانون کے اصول اور ضابطوں کی بنیاد ایسے اشخاص رکھتے ہیں جنہیں سوسائٹی پر حکمرانی حاصل ہوتی ہے، یہی لوگ ان اصول اور ضابطوں میں کاٹ چھانٹ اور تبدیلی کا کام بھی انجام دیتے ہیں گویا سوسائٹی ہی قانون کی تخلیق کرتی ہے اور اپنی ضروریات کے مطابق اسے تیار کرتی ہے۔ قانون سوسائٹی کا تابع ہوتا ہے، اس کی ترقی سوسائٹی کی ترقی پر موقوف ہوتی ہے۔

علماء قانون کے بقول قانون کے وجود کا آغاز زمانہ قدیم میں کنبہ کے وجود میں آنے ہی سے ہوا، قبائل کے وجود میں آنے سے اس میں تبدیلی پیدا ہوئی اور حکومت کے ترکیب میں آنے سے مزید تغیر واقع ہوئے۔ پھر فلسفیانہ و معاشرتی نظریات کی بنائی ہوئی بنیادوں پر تبدیلی کے آخری مرحلے کا آغاز اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ہوا۔ انسان کے وضع کردہ قوانین میں اس وقت سے اب تک عظیم تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ اور اب یہ ان اصول و نظریات پر کھڑے ہو چکے ہیں جن کا عہد گذشتہ میں وجود بھی نہ تھا۔

شریعت اور قانون کے مزاج میں فرق

شریعت اور قانون دونوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم بطور نتیجہ کہہ سکتے ہیں کہ ـــ شریعت اور قانون میں کوئی مماثلت نہیں، شریعت کا مزاج قانون کے مزاج سے یکسر مختلف ہے۔ اگر شریعت اور قانون کا مزاج یکساں ہوتا تو نہ تو یہ موجودہ شکل میں آئی ہوتی، نہ ہی اس کی وہ خصوصیات ہوتیں جن کا ذکر ہو چکا ہے، بلکہ اسے تو لازماً ایک ابتدائی شریعت کی حیثیت سے آنا چاہئے تھا، جو سوسائٹی میں انقلاب کے ساتھ قانون کی شکل اختیار کرتا جاتا، اور یہ قطعاً ممکن نہ ہوتا کہ شریعت ان جدید نظریات کو پیش کر سکے جنہیں قانون نے آخری زمانہ میں پہچانا، بلکہ اس کا ان نظریات تک پہنچ پانا بھی ممکن نہ تھا، مگر اسی وقت جبکہ ہزاروں سال گذر جاتے اور قانون ہی ان تک شریعت کی رہنمائی کرتا۔

افغانستان کے بعد

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پر

روسی قبضہ کا خوفناک منصوبہ!

یہ انکشاف تاشقند میں مقیم مبصر اور وقائع نگار مسٹر ولیم اے شمٹ کی ان یادداشتوں کا خلاصہ ہے جو کتابی صورت میں فرانسیسی زبان میں چھپیں، پھر یہ کتاب نایاب ہو گئی، شام کے ایک عالم نے اس کی کاپی کہیں سے حاصل کر کے عربی ترجمہ کیا اس کتاب کا نام ہے "یہودی جنگ عظیم سے پہلے" کتاب میں لکھا ہے :- "کمیونزم کو دنیا میں پھیلانے کے لئے ضروری ہے کہ روس، ترکی، ایران، افغانستان اور پاکستان میں اپنی فوجیں داخل کر دے۔"

اسی کتاب میں لینن کے حوالے سے یہ خوفناک انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ :- "مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی موجودگی میں کمیونزم کا فروغ محال ہے۔"

کہاں ہیں اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کرنے والے

فہل من مدکر ۵

ہندوستان میں سگریٹ نوشی کی عادت

ڈھلتے دن کی دھوپ چق کی تیلیوں میں سے اندر آرہی تھی، وہ اپنی زرد انگلیوں میں اپنی میز پر اضطراری انداز میں کوئی تال بجا رہا تھا، آخرکار اس نے ایک گولی نکالی اور معذرت کے انداز میں اسے منہ میں رکھ لیا۔

"سگریٹ نوشی ترک کرنے کی کوشش ہو رہی ہے"

میں نے پوچھا۔

"جی ہاں! آج خیر سے دوسرا ہی دن ہے، میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے بغیر کیسے بسر ہوگی"

وہ اس عادت کو ترک کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اس کے معالج نے اسے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا، کیونکہ اس کا مرض خطرناک حد تک جا پہنچا تھا۔ ڈاکٹر نے صاف صاف کہہ دیا تھا — "سگریٹ نوشی چھوڑ دیجئے یا پھر انجام کے لئے تیار ہو جائیے"

وہ ہندوستانی ہے اور مدراس میں رہتا ہے، ہندوستان اور دنیا کے دوسرے حصوں کے کروڑوں انسان اسی کی طرح اس مصیبت کا شکار ہیں۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جو ابتدائی کوشش کے بعد اپنی شکست کا اعتراف کرکے پھر سگریٹ کو منہ سے لگا لیتے ہیں۔ ۲۵ فیصد سے کم افراد اس عادت سے مستقلاً چھٹکارا پاتے ہیں اور اپنی مدت عمر میں اضافہ کر لیتے ہیں۔

ہندوستان میں تمباکو کے استعمال کے اعداد و شمار پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کے دیگر حصوں کی طرح ہندوستان میں یہ صحت کا عام مسئلہ نہیں ہے۔ مثلاً ہندوستان میں فی کس سالانہ استعمال محض ۱۹۰ سگریٹ ہے، جبکہ اس کے خلاف امریکہ میں ۴ ہزار، برطانیہ میں ۳۰۵۰ اور جاپان میں فی کس ۲۸۱۰ سگریٹ سالانہ استعمال ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں تمباکو کی مختلف اقسام کا فی کس مجموعی سالانہ خرچ ۷۷ء۰ کلوگرام ہے۔ اس کے خلاف امریکہ میں ۲۶ء۴ کلوگرام، نیدرلینڈز میں ۰۳ء۴ کلوگرام اور کنیڈا میں ۴ء۴ کلوگرام فی کس ہے۔

ان اعداد و شمار کے مطالعے میں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ہندوستانی خواتین کی بہت بڑی اکثریت سگریٹ نوشی نہیں کرتی، استثنائی صورتوں کے سوا ہندوستان میں سگریٹ نوشی کی عادت جنوب مشرقی ایشیا کے دوسرے ملکوں کی طرح ۱۵ سال سے زیادہ عمر کے لوگوں کی حد تک محدود ہے۔

تاہم شہر میں غریبوں کے علاقوں میں آٹھ یا دس سال کی عمر کے بچے یہ شغل کرتے نظر آتے ہیں، اس لئے اگر ان ملکوں میں سگریٹ نوشی کو بالعموم ایک بڑا مسئلہ صحت نہیں

سمجھا جاتا تو اس کی ایک اور وجہ بھی ہے، اور وہ یہ کہ یہاں ملیریا، ٹی بی، دق، ہیضہ، ورم دماغ اور دیگر کئی زہریلے اور پانی کی وجہ سے پیدا ہونے والے امراض پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ سگریٹ نوشی جو [illegible] نکوٹین کی مزمن زہر آلودگی ہے، چور کی طرح اندھیرے میں گھس آتی ہے اور وہ اب بھی اکثر کانوں کان خبر ہوئے بغیر انسانوں کی متاع حیات چرائے جاتی ہے۔

اگر ہندوستان میں سگریٹ یا تمباکو نوشی کے خلاف کوئی انجمن قائم ہو تو اس سے ان پڑھ طبقے کو خاص بڑی [illegible] ہوگی، کیونکہ ہندوستان کے عوام کی اکثریت سگریٹ نوشی کی وجہ سے لاحق ہونے والی نقصان دہ بیماریوں کے بارے میں طبی شہادتوں سے متاثر نہیں ہوتی، بدقسمتی سے ہندوستان کی طبی برادری کی خاصی بڑی تعداد خود بھی سگریٹ پیتی ہے، ان میں سے بعض تو خوب پیتے ہیں، یہ ایک ایسی صورت حال ہے جس میں مریض یہ کہنے میں حق بجانب ہوگا کہ "مسیحا! پہلے اپنا علاج کر لیجئے!"

ہندوستان میں تمباکو نوشی کے مختلف طریقوں کا جائزہ دلچسپی کا موجب ہوگا۔ ہندوستان میں اب تک تمباکو نوشی کی سب سے عام صورت "بیڑی" ہے۔ بیڑی بنانے کے لئے تیز تمباکو کو ایک [illegible] کے پتے میں لپیٹ دیا جاتا ہے، اس پیڑ کی [illegible] اور آندھرا پردیش میں بہ کثرت کاشت ہوتی ہے۔ بیڑی، غریب کا سگریٹ ہے۔ اسی لئے گذشتہ کئی برسوں سے اسے ٹیکس کی چھوٹ دے دی گئی ہے۔ ملک کے بعض حصوں میں مزدور عورتیں بھی بیڑیاں پیتی ہیں۔ بیڑی کی صنعت سے ملک میں لاکھوں کو روزگار ملتا ہے، اکثر صورتوں میں تو خاندان کے خاندان صرف اسی پر چلتے ہیں۔

سگریٹ نوشی میں اضافہ

ہندوستان میں اس صدی کی چھٹی دہائی تک سگریٹ نوشی میں زبردست اضافہ ہوگیا تھا اور ساتویں دہائی کی ابتدا میں اس کی تیاری میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان میں ۵۲ بلیون سگریٹ تیار ہوئے جبکہ ۱۹۷۰ء میں ۶۵ بلیون سگریٹ بنائے گئے۔ ۱۹۷۵ء میں یہ تعداد گھٹ کر ۶۰ بلیون ہوگئی۔ ۱۹۷۶ء سے سگریٹ نوشی میں پھر کسی قدر اضافہ ہوا ہے، اگرچہ یہ اضافہ آبادی کے لحاظ سے خاصا کم ہے۔

کارخانوں کا بنا ہوا سگریٹ بالعموم شہری علاقوں کا متوسط اور اعلیٰ طبقہ پیتا ہے، اگرچہ حالیہ چند برسوں میں دیہات کا زمیندار طبقہ بھی سگریٹ پینے لگا ہے۔ ایکسائز ڈیوٹی میں اضافے سے اعلیٰ قسم کے سگریٹ ہر سال مہنگے ہوتے جاتے ہیں، مگر یہ بات محسوس کی گئی ہے کہ اس اضافے سے اب تک سگریٹ کی کھپت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے، بعض سگریٹ نوش اپنے برانڈ کا سگریٹ زیادہ قیمت دے کر بھی خریدتے ہیں، جبکہ دوسرے گھٹیا سگریٹ نوشی کرنے لگتے ہیں یا پھر بغیر فلٹر کے سگریٹ پینے لگتے ہیں۔

سگریٹ اور بیڑی نوشی کے بعد دوسرا سب سے عام طریقہ تمباکو کھانا ہے، تمباکو کو پان میں ڈال کر کھایا جاتا ہے، اس پان کو گھنٹوں منہ میں رکھا جاتا ہے اور یہ بالعموم منہ کے سرطان کا باعث بنتا ہے۔

ہندوستان میں سگار شاذونادر ہی پیا جاتا ہے، تاہم مزدوروں اور آندھرا پردیش کے تحت کشش طبقے میں چرٹ (سگار جیسی تمباکو کی بتی ہوئی پنسل) نوشی عام ہے۔ بہت سے مریضوں میں حلق کے کینسر کی وجہ چرٹ ہی کو قرار دیا گیا ہے۔

ایک عام ہندوستانی شہری تمباکو نوشی کیوں کرتا ہے؟ بیڑی نوش اسے بے سوچے سمجھے اپنی زندگی کے شروع ہی میں اختیار کر لیتا ہے، ان طبقات میں تمباکو نوشی کو گناہ یا بری بات نہیں سمجھا جاتا، یہ محض وقت گذارنے کا ایک طریقہ ہے۔ تاہم عام سگریٹ پینے والوں کی نظر میں اس عادت

(باقی صفحہ … پر)

از طارق احسن فلاحی

حقدار کون؟

"یا ام حبیبہ! میں اِدھر چند ہفتوں سے کچھ ایسی باتیں سن رہا ہوں جو مجھے انہونی معلوم ہوتی ہیں۔ آہ! میں یہ کیا سن رہا ہوں!" صامت نے اپنے تعجب و تاسف کا اظہار کیا۔

"کون سی باتیں، کس کی باتیں؟" ام صامت کی بیگم کی آنکھیں سوالیہ نشان بن گئیں۔

"مجھے قریبی ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ حبیبہ اور اس کا خالہ زاد بھائی افلح ایک دوسرے کی ذات میں زبردست دلچسپی لے رہے ہیں، ان کی یہ آشنائیاں ایک جان دو قالب بننے کا خواب دیکھ رہی ہیں اگر یہ خبر معتبر ہے تو مجھے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا ہے کہ مبادا یہ اپنی نئی زندگی کے آغاز کا عہد و پیمان کر بیٹھیں اور اگر ایسا ہوا تو وہ دن ہمارے لئے سب سے زیادہ رسوائی کا دن ہوگا۔" صامت نے رازدارانہ باتوں سے پردہ اٹھا دیا۔

"تمہارا اندیشہ کل ہی حقیقت کے روپ میں ہمارے سامنے ظاہر ہو چکا ہے۔" ام حبیبہ نے اپنے شوہر کی بےچینی میں اور اضافہ کر دیا۔

"وہ کیسے؟" صامت فکرمند ہو گیا۔

"افلح کی ماں کل ہمارے پاس اپنے بیٹے کا پیغام لیکر آئی تھی۔"

"تو تم نے کیا جواب دیا؟" صامت

"میں نے صاف انکار کر دیا کہ حبیبہ کا نکاح بہت [illegible] قبل مدینہ کے رہنے والے عبداللہ نامی شخص سے ہو چکا ہے، اس لئے افلح کے پیغام کو قبول کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تمہارے انکار سے حبیبہ پر کیا ردعمل ہوا؟"

"اپنی خالہ کے سامنے تو وہ خاموش رہی، مگر بعد میں وہ زخمی شیرنی کی طرح بپھر پڑی۔"

"جب آپ لوگوں نے میرے جذبات کا کوئی خیال نہیں کیا تو پھر مجھے بھی یہ حق حاصل ہے کہ اس معاہدہ کو جو آپ لوگوں نے میری کم سنی میں انجام دیا ہے، اسے ٹھکرا دوں۔ میں اپنے آپ کو اس پچاس سالہ معمر شخص کی رفاقت میں دے کر اپنی زندگی کو جہنم زار نہیں بنا سکتی، لیکن اگر آپ لوگوں نے مجھے مجبور کرنے کی کوشش کی تو میں خود اپنی زندگی میں موت کا سامان فراہم کروں گی اور اس کے ذمہ دار آپ لوگ ہوں گے، مان لیا کہ عبداللہ مدینہ کے اہل ثروت لوگوں میں سے ایک ہے، اس کے دروازے پر اونٹوں کی قطاریں اس کی خوشحالی کا ثبوت ہیں، یہ بھی تسلیم کہ اس کی تلوار کی کاٹ میدانِ جنگ میں دشمنوں کے چھکے چھڑا دیتی ہے اور نوعمر بچیاں اس کی شجاعت و دلیری کے گیت گاتی ہیں، لیکن عبداللہ کی یہ دولت و ثروت یہ شجاعت و بطالت اور یہ دلیری و سخاوت کسی کی زندگی کا سکون نہیں بن سکتی، اگر کسی کے گھر میں آگ لگی ہو تو اس کیلئے گلاب کا چھڑکاؤ کیا کام دے سکتا ہے، کیا ارمانوں کی اجڑی

ہوئی دنیا کے لئے عیش و عشرت کی نمائش کارآمد ہو سکتی ہے
اور ہاں کان کھول کر سن لو، اماں کہ میں نے اپنا دامن حیات
اللہ کے ہاتھوں میں دینے کا اس سے عہد کر لیا ہے۔" ام حبیبہ
اپنے جذبات کے سیل رواں میں بہی جا رہی تھی۔

"کھٹ ... کھٹ ... کھٹ" کسی نے دروازہ پر
دستک دی، اور ام حبیبہ نے اپنی گفتگو کا سلسلہ روک دیا۔
صامت خود وارد کے استقبال کے لئے آگے بڑھا۔

"السلام علیکم" ایک دیہاتی دروازہ کے اندر داخل
ہوا۔

"وعلیکم السلام ۔۔۔ اہلاً و سہلاً" صامت نے آگے بڑھ کر
اپنے مہمان کا خیر مقدم کیا۔

"حبیبہ کہاں ہے، اس سے کہہ دو کہ اس کی سسرال سے
اس کے شوہر کا ایک قاصد آیا ہے، وہ اس کی تواضع کرے
اور ... رخصتی کا اہتمام کرے" صامت نے اپنی بیوی
کو ... دیا۔

حبیبہ اپنے باپ کی موجودگی میں اس کا حکم نہ ٹال سکی
... بھی اس نے خاطر مدارات میں کوئی کسر
نہ اٹھا رکھی اور میزبانی کے قومی شعار پر آنچ نہ آنے دی۔
دیہاتی نے چند گھنٹے قیام کئے اور وہ اپنے ساتھ لائے
پیغام کو صامت کو سنا کر روانہ ہو گیا۔

صامت کا ہمدم ... کے بحر عمیق
میں غوطہ زن ہو گیا۔ اس کے ذہن کے پردے پر عہد ساسات
کا ایک ناقابل فراموش منظر سینما کی ریل کی طرح ابھرنے
لگا۔ وہ چشم تصور سے فوج کشی کے اس منظر کو دیکھنے میں منہمک
ہو گیا جس میں کہ وہ خود شریک تھا۔ مجاہدین قوت ایمانی سے سرشار
اپنی بے سرو سامانی اور قلت ہتھیار سے بے خبر چلچلاتی دھوپ
میں پیچ و تاب کھاتے ریگستان کو عبور کرتے ہوئے فوجی مہم پر
جا رہے تھے۔ ان مجاہدین کی اکثریت پا پیادہ تھی اور وہ خود
پیدل چلنے والوں میں سے تھا۔ چلتے چلتے جب اس کے پیر
جلنے لگے، ریگزار کی تپش سے جب وہ آبلہ پا ہو گیا، اور تلوے
کی جلن نے جب اسے ننگے پاؤں چلنے سے مجبور کر دیا تو اس
نے اپنے رفیقوں کے سامنے ایک جوڑا جوتا کے لئے دست
طلب دراز کیا، عبداللہ نامی ایک شخص نے اس کے حال زار
پر ترس کھا کر بلا معاوضہ ایک جوڑا جوتا پیش کر دیا لیکن اس کی
غیرت نے بلا معاوضہ لینے سے انکار کر دیا، اور اس شرط پر
قبول کرنے کے لئے رضامند ہوا کہ وہ اس جوتے کو دین مہر خیال
کرتے ہوئے اپنی بیٹی حبیبہ کو اس کے نکاح میں دے دے گا۔
عبداللہ نے شرط منظور کر لی اور مجاہدین کے درمیان اس نے
اپنی نابالغ بیٹی کا نکاح عبداللہ سے کر دیا اور جوتے کو دین مہر
قرار دیا۔

"کیا سوچنے لگے؟" قریب بیٹھی ہوئی ام حبیبہ نے صامت کو
خاموش دیکھ کر اس کے خیالات کا بہاؤ روک دیا۔

"عبداللہ نے جلد ہی رخصتی کرانے کا پیغام بھیجا ہے،
سوچ رہا ہوں کہ دس بارہ سال کا عرصہ کتنی جلد گزر گیا، ایک
وہ وقت تھا کہ ہماری حبیبہ چند سال کی تھی، جب میں نے
اس کا نکاح عبداللہ سے کیا تھا اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کا دور تھا اور آج جبکہ حبیبہ بالغ ہو چکی ہے کہ حضرت عمر کا زمانہ
ہے، نیز اس وقت ہم اتنے تنگ حال تھے کہ ایک جوڑا جوتا کے
عوض حبیبہ کا نکاح کرنے پر مجبور ہوئے، اور آج اللہ کا فضل
ہے کہ ہر طرح کی آسائش نصیب ہے۔"

"لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ حبیبہ عبداللہ کو
قطعی ناپسند کرتی ہے، وہ اس کی شریک حیات بننے کے لئے کسی
طرح بھی تیار نہیں۔ جب سے اس کو معلوم ہو گیا ہے کہ اس کے
والدین نے صغر سنی میں اس کا نکاح عبداللہ سے کر دیا ہے
وہ اس وقت سے کھوئی کھوئی نظر آتی ہے اور اس کے
مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو گیا ہے۔"

"یہ سب اس کی طفلانہ حرکتیں ہیں، ہم نے جو معاہدہ کیا
ہے وہ کسی حال میں فسخ نہیں ہو سکتا۔" صامت نے

اپنے اس فیصلے سے ام حبیبہ کو آگاہ کیا۔

ایک دن حبیبہ کی ماں اپنے مکان کی چھت پر بیٹھی تھی کہ اچانک اس کی نگاہ اپنے مکان کے سامنے پھیلے ہوئے ریگزار کی طرف اٹھ گئی، دیکھا کہ کوئی شتر سوار غبار اڑاتا ہوا اسی کی طرف آرہا ہے، بغور دیکھنے پر اسے شبہ ہوا کہ حبیبہ کا شوہر عبداللہ ہے اور فاصلہ قریب ہوتے ہی شبہ حقیقت میں تبدیل ہو گیا۔ ام حبیبہ چھت سے نیچے اتر کر اپنی بیٹی کے پاس آئی اور کچھ بولنا ہی چاہتی تھی کہ گھوڑے کی ہنہناہٹ کے ساتھ دروازے پر دستک ہوئی، حبیبہ کی ماں سمجھ گئی کہ وہ اور کون ہے، اس نے بیتابی کے ساتھ آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

"السلام علیکم یا ام حبیبہ!" عبداللہ گھوڑے کو دروازہ پر باندھتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

"وعلیکم السلام، مرحبا مرحبا" حبیبہ کی ماں نے مسکراتے ہوئے اپنے مہمان کا استقبال کیا۔

"ضامت کہاں ہے" عبداللہ نے متجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"باہر گئے ہوئے ہیں" ام حبیبہ نے اطمینان دلایا۔

"ام حبیبہ! تم نے میری آمد سے یقیناً اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں کس لئے آیا ہوں"

"ہوں، تم حبیبہ کو لینے آئے ہو نا"

"بڑی ذہین معلوم ہوتی ہو، اچھا جاؤ اپنی بیٹی کو تیاری کا حکم دے دو"

ام حبیبہ اپنی بیٹی کے پاس آئی اور خوشامدانہ انداز میں بولی۔ "بیٹی! جاؤ اپنے شوہر کا بڑھ کر خیر مقدم کرو"

"میں اس جاہل شخص کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گی"

اپنی ماں کی بات سے حبیبہ کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی ہو۔

"تو تم کو اپنے مہمان کی عزت کا خیال نہیں" ام حبیبہ نے اپنی بیٹی کی عزت کو کچوکا لگایا۔

"میں عزت وزت کچھ نہیں جانتی، جب آپ لوگوں نے میری عزت نفس کا کوئی کوئی خیال نہیں کیا تو پھر میرے دل میں بھی جو آئے گا کروں گی"

"تو تم نہیں جاؤ گی؟"

"نہیں! نہیں! ہرگز نہیں!!"

"تمہیں جانا پڑے گا"

"اچھا جب آپ اتنا مجبور کر رہی ہیں تو جاتی ہوں" حبیبہ بے دلی اور بدلے ہوئے تیور لئے عبداللہ کے پاس آئی اور سپاٹ لہجے میں سلام کرتی ہوئی بولی، "اس وقت آپ ہمارے مہمان ہیں [illegible]"

"بکواس بند کرو، کیا تمہارے باپ نے ہمارے ساتھ تمہارا عقد نہیں کیا ہے؟ کیا تم ہماری زوجہ نہیں ہو؟"

"نہیں، بالکل نہیں، وہ معاہدہ میرے باپ نے کیا تھا، اس سے میرا کوئی تعلق نہیں، میں نے آپ سے کوئی معاہدہ نہیں باندھا، میرے باپ نے میری کمسنی میں جو معاہدہ کیا تھا میں اسے بہت پہلے فسخ کر چکی ہوں، اب نہ تو آپ کو ہم پر کوئی اختیار ہے اور نہ ہی ہمارے والدین کو، کیا آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی رد کر رہے ہیں کہ "بالغ اولاد اپنے فیصلے اور آزادی رائے کی خود مالک ہے"

عبداللہ، حبیبہ کی دریدہ دہنی سے حیران و ششدر رہ گیا، اور اپنی قہر آلود نظروں سے ام حبیبہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا

"معلوم ہوتا ہے کہ خلع والا واقعہ صحیح ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں عبداللہ کی جان ہے، اگر آج خلع ہمارے درمیان آگیا تو اپنے نیزے کی پوری انی اس کے سینے میں اتار دونگا" شدت غیظ سے عبداللہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"یہ آپ کا وطن نہیں ہے، اپنی بہادری کی دھونس اپنے ہم وطنوں پر دکھائیے گا، اگر ابھی خلع موجود ہوتا تو آپ کی طاقت

کا سارا نشہ ہرن کر دیتا ۔" حبیبہ کے زہر آلود الفاظ نے عبداللہ کے لئے جلتی پر تیل کا کام کیا، وہ بھوکے شیر کی طرح حبیبہ کی طرف لپکا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے کے لئے گھسیٹنے لگا۔

"وعلیکم السلام! ۔۔۔" اسی لمحہ چھت سے کوئی کودا۔

سب کی نگاہیں جست لگانے والے کی طرف مرکوز ہوگئیں، افلح اپنی تلوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا اور فوراً ہی عبداللہ کی طرف جھپٹا اور ایسا جھٹکا دیا کہ حبیبہ کا ہاتھ عبداللہ کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔

"کیا تو ہی میری بیوی حبیبہ کا عاشق ہے؟" عبداللہ نے کھا جانے والی نگاہوں سے افلح کو تاکا۔

"حبیبہ تیری منکوحہ ہے یا میری، اس کا فیصلہ میری تلوار کرے گی۔" افلح تلوار سونت کر کھڑا ہوگیا۔

"اگر تجھے اپنی بہادری پر ناز ہے تو شاید آج کے بعد دنیا کو تیری جوانی کی بہار دیکھنا نصیب نہ ہو۔" عبداللہ اپنی تلوار لینے کے لئے دوڑا۔ ام حبیبہ بھی اس کے پیچھے لپکی اور تلوار پکڑ کر گڑگڑانے لگی۔

"خدارا! ایسا مت کرو عبداللہ!"

"نہیں، چھوڑ دو ام حبیبہ! آج اس کا فیصلہ تلوار ہی کرے گی، یا تو افلح کی جان جائے گی یا عبداللہ کی۔" افلح بھی تلوار لئے آدھمکا۔

اتنے میں صامت بھی باہر سے آگیا، اور یہ لرزہ خیز منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا، وہ افلح اور عبداللہ کے درمیان آکر فیصلہ کن لہجے میں چیخا۔

"اس کا فیصلہ تم دونوں کی تلواریں نہیں بلکہ امیرالمومنین فرمائیں گے۔"

"ہاں ہاں، بالکل درست۔" ام حبیبہ نے بھی صامت کی تائید کی۔

آخرکار سب لوگ اس بات پر راضی ہوگئے اور مسجد نبوی کی طرف چل پڑے، عصر کی نماز سے فراغت کے بعد حضرت عمرؓ اپنے احباب کے ساتھ محو تکلم تھے۔

"السلام علیکم" ام حبیبہ نے آپؓ کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرنی چاہی۔

"وعلیکم السلام، کیا بات ہے؟"

"ایک اہم معاملے میں قرآن و سنت کے مطابق فیصلہ لینے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔"

"اطمینان رکھو، ویسا ہی ہوگا۔" امیرالمومنین نے دلاسا دلایا۔

اتنے میں صامت نے آگے بڑھ کر پورا معاملہ امیرالمومنینؓ کے سامنے از اول تا آخر دہرا دیا اور عبداللہ نے اسکی توثیق کر دی۔

"یا امیرالمومنینؓ!" حبیبہ سے خاموش نہ رہا گیا، اور اس نے بے صبری کے ساتھ آپؓ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ "جس وقت میرے باپ نے میرا نکاح عبداللہ سے کیا، میں وہاں موجود نہ تھی، نیز میں چند سال کی بچی تھی" حبیبہ نے اپنے موافق فیصلہ کی امید میں پر اعتماد لہجے میں بیان دیا۔

"تمہاری عدم موجودگی اور کم سنی نکاح کے جواز پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔"

"مگر عرصہ ہوا کہ میں اسے فسخ کر چکی ہوں۔"

"تجھکو فسخ کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔" عبداللہ اپنے جذبات سے بے قابو ہوگیا۔

"عبداللہ! قرآن و سنت کے معاملہ میں من مانی نہ کرو، چونکہ وہ تیرے گھر کبھی نہیں گئی، اس لئے اس کو فسخ کرنے کا پورا اختیار ہے۔" امیرالمومنین کے پر جلال لہجہ کو دیکھ کر عبداللہ کانپ اٹھے۔

"تو میں کوئی چیز نہ ٹھہرا۔" صامت کا رنج و غم سے چہرہ اتر گیا۔

"کیوں نہیں، اگر تیری بیٹی نے نکاح فسخ نہ کیا ہوتا تو تیرا معاہدہ قائم رہتا، لیکن چونکہ تم نے اپنی بیٹی کا نکاح

اس وقت کیا جب وہ نابالغ تھی، اور بالغ ہونے پر اس کو اختیار کلی ہے کہ وہ نکاح کو فسخ کردے۔ اب نہ تو تم حبیبہ پر جبر کرسکتے ہو اور نہ ہی عبداللہ، اب وہ اپنے نفس کی خود مالک ہے۔" امیر المومنینؓ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"کیا میں حبیبہ سے نکاح کرسکتا ہوں؟" افلح کے چہرے پر فرحت و شادمانی رقص کرنے لگی۔

"یہ تو حبیبہ کی مرضی پر ہے۔"

"میں راضی ہوں یا امیر المومنین!" حبیبہ کی رضامندی پر افلح کا نکاح اسی مجلس میں ہوگیا۔

نکاح کے بعد مدامت اور ام حبیبا اپنی بیٹی کو خیر و برکت کی دعائیں دے رہے تھے اور ایک طرف عبداللہ اور صالح ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے کو گلے لگا رہے تھے۔

مغرب کے تحفے!

کچھ برس قبل حکومت برطانیہ نے فحاشی کے بارے میں ایک کمیشن لارڈ لانگ فورڈ کی سربراہی میں مقرر کیا تھا، اس نے جو تحقیقات کی ہیں ان میں لندن کے ایک آرچی بالڈ رکلب کا ذکر ہے، جہاں [illegible] ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کی ننگی فلمیں دکھائی جاتی ہیں، ایک [illegible]

[illegible] جہاں فحاشی ... حضرات کو جنسی اذیت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ برطانیہ میں کئی ایسی ریکارڈنگ کمپنیاں ہیں جو جنسی تجربات کو [illegible] کے کروڑوں کماتی ہیں۔ ایک کتاب جو عریانی، فحاشی اور ہیجان انگیزی میں حرف آخر ہے، اس کے بیسیوں ایڈیشن لاکھوں کی تعداد میں بک گئے اور ابھی تک فروخت ہو رہی ہے اور اس کے قارئین میں ۲۰ سال [illegible] لڑکے لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ننگی فلموں میں کام کرنے کے لئے لڑکیوں کی ضرورت کا اشتہار چھپتا ہے تو سیکڑوں شریف گھرانے کی لڑکیاں آمادگی ظاہر کرتی ہیں۔

ابوالبیان حماد

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

جہاں میں دین حق کا بول بالا کردیا تو نے
جلا کر مشعل قرآں اجالا کردیا تو نے

پرستاران باطل لرزہ براندام رہتے ہیں
شبستانوں میں اک کہرام برپا کردیا تو نے

بڑی حیرت ہے تیری جرأت رندانہ پر مجھ کو
کہ اسلامی حکومت کا تقاضا کردیا تو نے

ستاروں پر کمند عزم و ہمت پھینکنے والے
زمیں ناپاک کو رشک ثریا کردیا تو نے

علمبردار تحریک نظام دین اسلامی
جھکا کر ظلم کا سر خود کو اونچا کردیا تو نے

اسی جرم محبت نے تجھے زنداں میں پہنچایا
کہ راہ حق میں اظہار تمنا کردیا تو نے

جوانوں کی رگوں میں بجلیاں تو نے جہاں بھر دیں
وہیں بوڑھے لہو میں جوش پیدا کردیا تو نے

سواد مصر و ایران و یمن سب جگمگا اٹھے
جو پھر روشن چراغ طور سینا کردیا تو نے

تجلی گاہ فطرت سے جو کوسوں دور رہتے تھے
انھیں حیرت سے سرگرم تماشا کردیا تو نے

تری تقریر پہ اردو زباں قربان ہوتی ہے
ادب کو جلوۂ حق سے شناسا کردیا تو نے

تری تحریر میں ہیں ٹھنڈی ٹھنڈی بجلیاں پنہاں
ہر اک بزم آشنا کو رزم آرا کردیا تو نے

نہ کیوں حماد کو تجھ سے محبت ہو عقیدت ہو
خودی کا راز پھر دنیا پہ افشا کردیا تو نے

ایڈیٹر کی نظر میں

"یتیم خانہ کی کہانی بانی کی زبانی"

ناشر:- شعبۂ نشر و اشاعت یتیم خانہ اسلامیہ -

گیا، چیرکی، بہار -

صفحات:- ۴۰ - سائز:-

یہ ایک مختصر سا کتابچہ ہے جسے بانی یتیم خانہ جناب خلافت خاں مرحوم نے اپنے ایک عزیز کے ذریعہ اپنی وفات سے پانچ سال قبل مرتب کیا تھا، اس میں بانی مرحوم نے یتیم خانہ کی کہانی راستے کے نشیب و فراز، پہاڑیاں اور گھاٹیاں اور اپنی آرزوئیں اور تمنائیں سبھی کچھ بیان کر دی ہیں، اس ادارہ کو تقریباً ۶۰ سال سے زائد قائم ہوتے ہو چکے ہیں، میں نے بچشم خود اس ادارہ کو دیکھا ہے، وہاں کے طلبہ اور مشفق اساتذہ سے ملاقاتیں کی ہیں۔

پیش لفظ جناب طارق احسن فلاحی نے لکھا ہے، فرماتے ہیں:- "وہ ایک ایسا علمی قلعہ بن جانا چاہئے جہاں باطل کی دندانی قوتوں کو کچلنے کیلئے جدید ہتھیاروں کا وافر ذخیرہ مہیا ہو"۔

اس عظیم نصب العین کے پیش نظر ابھی یتیم خانہ "ہنوز دلی دور است" کا مصداق ہے، لیکن اگر ملت کے اصحاب خیر اور دردمند مسلمان یتیموں کے اس آشیانہ کی طرف توجہ دیں تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔

یہ ادارہ قوم کے باغیرت اور مخلص مسلمانوں کی نظر کرم کا شدت سے محتاج ہے، کیا قوم کے ان بچوں کی فریاد لاحاصل چلی جائیگی۔

"جماعت اسلامی کے سلسلے میں چند سوالات اور ان کے جوابات"

مرتبہ احسن مستقیمی

ناشر:- ادارۂ تحقیقات سہارن پور

ملنے کا پتہ:- مکتبہ تحقیقات چوک کنگلاں سہارن پور

قیمت:- صرف دو روپیے - ۲/-

یہ کتابچہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، جماعت اسلامی سے متعلق چند سوالات اور ان کے جوابات پر مشتمل ہے،

جماعت اسلامی کیوں؟

فرقہ پرستی و فرقہ بندی کیا ہے؟

جماعت اسلامی اور آر ایس ایس گٹھ جوڑ کا افسانہ؟

کمیونسٹوں کی سازشیں - وغیرہ

عناوین پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے - ضرورت ہے کہ اس طرح کے کتابچے وسیع پیمانے پر ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہونچائے جائیں۔

کتابت و طباعت عمدہ، ٹائیٹل دلکش ہے۔

"گل گلزار"

میانوالی ریلوے اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں میں جب فرید پراچہ مولانا مودودی کے سامنے آئے تو مولانا نے ان کا تعارف چاہا۔ لوگوں نے بتایا کہ مولانا گلزار احمد مظاہری کے صاحبزادے ہیں، جناب سید نے برجستہ فرمایا:- "تو یوں کیوں نہیں کہتے کہ یہ گل گلزار ہیں"۔

حلقۂ یاراں

اسلام اللہ پریمی
اقامت گاہ درس گاہ
۳ر جنوری [illegible]ء

مکرمی! السلام علیکم

نئے سال کا رسالہ نظر نواز ہوا، خاصا اچھا ہے، لیکن اتنا بھی اچھا نہیں کہ آپ مطمئن ہو جائیں، کاتب صاحب اچھے ہیں، کاغذ بھی اچھا ہے، مضامین بھی اچھے ہیں، طباعت بھی اچھی ہے، لیکن ٹائیٹل اچھا نہیں، اسے دیکھ کر مجھے مائل صاحب کی وہ بچوں کی نظم یاد آگئی جسے انھوں نے "مرے ک ب و ت د..." سے شروع کیا ہے، کسی کتاب یا رسالہ کی رونمائی اس کے صفحۂ اول سے ہوتی ہے اور اس کی جاذبیت پڑھنے والے کو ابھارتی ہے، اس لئے اس صفحہ پر خصوصی توجہ دیں اور اس کے بارہ میں دوسرے قارئین کی رائے معلوم کرنے کے بعد کسی ایک نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کریں۔ خود میری رائے یہ ہے کہ ٹائٹل کی داہنی طرف اوپر ۲/۳ حصہ گھیرے میں جامعۃ الفلاح کی مسجد کا فوٹو اس زاویہ سے دیا جائے کہ اس کے دو مینار اور چند دروں کا نقشہ آجائے اور اس کے نیچے "حیات نو" رسالہ کا نام ہو، مسجد کے نقشہ کی تجویز جامعہ کی مناسبت سے ہے (اس لئے کہ آپ سب کے سب فلاحی ہیں) اور "حیات نو" کا پیغام "فلاح مسجد" سے بہتر اور کہاں سے ہو سکتا ہے، بہرحال یہ ایک تجویز ہے اور اس سے بہتر بھی تجاویز آسکتی ہیں۔

اس بار رسالہ کے مضامین بہت پسند آئے، شاید ایک مضمون کے علاوہ سارے ہی مضامین میں نے ایک ہی نشست میں دیکھ ڈالے، اس لحاظ سے رسالہ مختصر ہے، اسے کچھ اور ضخیم ہونا چاہئے، مضامین حالات حاضرہ پر زیادہ ہوں تو اچھا ہے، گھٹیا قسم کے افسانوں سے پرہیز کیجئے، نظمیں اور غزلیں معیاری ہونی چاہئیں، ٹائیٹل کے صفحہ کو زیادہ کارآمد بنائیے، ایک صورت تو یہ ہے کہ سارے مضامین میں سے کسی مضمون کا کوئی خاص حصہ صفحۂ اول پر دیجئے، یا پھر جیسا اس بار آپنے گیلانی صاحب کی کتاب کا ایک پیراگراف دیا ہے، اسی طرح آئندہ بھی مختلف کتابوں کے مخصوص پیراگراف دیجئے۔ ایک دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ "اداریہ" (جسے خواہ مخواہ آپ نے "دھڑکنیں" بنا دیا ہے) اسے صفحۂ اول سے شروع کیجئے اور دوسرے صفحہ تک لے جائیے، لیکن یہ اسی صورت میں بہتر رہے گا جب "حیات نو" کے ٹائیٹل کا ایک گوشہ آپ مخصوص کر دیں، جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا۔ ان سب کے بعد ایک ضروری گذارش یہ ہے کہ اشتہارات کیلئے "فاران" کی طرح آپ اول یا آخر میں الگ صفحات لگائیں، موجودہ صفحات میں کٹوتی نہ ہو۔

دھڑکنیں اور دل کی پکار کی بات سمجھ میں نہیں آئی، آپ

اداریہ کا عنوان اگر دل کی پکار رکھتے تو بھی غنیمت تھا۔ لیکن احباب کے خطوط مندرجہ بالا عنوان کے تحت کچھ عجیب سے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو "گرمی گفتار"، "رنگ رنگ"، "آئینے"، "مشہورات"، "مجلس یاراں"، "گل افشانیاں" جیسے بہت سے عنوان ملیں گے جو آپ بھی پسند کریں گے اور دوسرے بھی، بہر حال یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے، جس پر بہت زیادہ لکھا پڑھی کی جائے۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں۔

اسلام الشد بریمی

ادارہ: — نہایت قابل قدر مشورے ہیں، دوسرے احباب بھی اظہار خیال فرمائیں۔

ادارۂ تحقیق
پان والی کوٹھی - دودھپور
علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
۱۹ جنوری [illegible]

برادر عبید صاحب!
نذرانۂ تسلیم و تبریک

خدا کرے بعافیت ہوں۔ آج ترجمہ [illegible] کی [illegible] ہستی نے اپنے ذمہ لے ہی لی جس کی تمنا ہم زمانۂ طالب علمی میں کیا کرتے تھے، اگرچہ نامکمل تمنا زندہ دلوں میں لئے ہم مادر علمی کو خیرباد کہہ آئے۔ لاریب یہ مسرت تا حد سیکڑوں دلوں میں ہے جن کی یہ خواہش پیدا ہوئی کہ [illegible] لے کاش ہم فلاح کے طالب علم اب ہوتے، لیکن یقیناً یہ خواہش بھی تشنۂ تکمیل ہی رہے گی۔

محترم مولانا ابواللیث صاحب کی حیثیت صرف ناظم ہی کی نہیں ہے، بلکہ وہ مہتمم جامعہ بھی ہیں، آپ ان کی خداداد صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے کہ وہ تعلیمی امانت اور صحافتی ذمہ داریوں کو [illegible] انجام دیں گے اور "فلاح" کو دنیا کی اس منزل پر پہنچا دیں گے، جس کی امید مولانا مودودی علیہ الرحمۃ نے باندھ رکھی تھی۔

لاکھوں صد شکر ہوگا یہ حیات نو اگر اس کو مولانا محترم کی سرپرستی حاصل ہو جائے۔

افغانستان کی موجودہ صورت حال انتہائی تشویشناک ہے، واقعہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں اسلام دشمن طاقتیں ابھرتے ہوئے اسلام کو پسپا کرنے کے لئے منظم کوششیں کر رہی ہیں، ابھی حال ہی میں خانۂ کعبہ کا شرمناک واقعہ اسکی مثال ہے، یہودیت و عیسائیت کے یہ ناپاک عزائم جو مختلف شکلوں میں ابھر کر سامنے آرہے ہیں، اسلام کو [illegible] برداشت نہیں کر سکتے، مگر ہمیں یقین کامل ہے کہ اسلام کے تیز و تند سیل رواں کے سامنے اشتراکیت، یہودیت اور عیسائیت جیسے باطل نظریات خس و خاشاک کی طرح بہ جانے والے ہیں۔ خدا اسلامی مجاہدین کی ہر طرح سے مدد فرمائے۔ رفقاء کو سلام کہیں۔ والسلام

نرہری — ۹ جنوری [illegible]

کمیونزم زوال رکتا ہے
جہاں اس کے سامنے دیوار آجائے

روس کے جارحانہ عزائم کے بارے میں کوئی سوال کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی بچھو سے یہ سوال کرنا کہ وہ ڈنک کیوں نہیں مارتا، وہ ڈنک مارنے کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتا، یہی حالت کمیونزم کی ہے، دنیا پر اقتدار حاصل کرنے کی بد خواہ اور غیر معقول جبلت مسلسل زیادہ سے زیادہ فتوحات حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے، دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

کیا افغانستان کا المیہ فی الواقع آج سے دو سال پہلے پیش نہیں آیا تھا، لیکن مغرب نے آنکھیں بند کر لیں اور حقائق کو سمجھنے کی کوشش نہ کی "[illegible]" کے پر فریب سراب کی خاطر سالہا سال پہلے یہ روایت بن گئی ہے کہ "تعلقات باہمی" "[illegible]" کی تلاش میں "اپنی اصطلاحات کے استعمال" حقائق سے انکار کیا جا رہا ہے (مشہور روسی نوبل انعام یافتہ الیگزینڈر سولزے نتسن)

محبّتوں اور عقیدتوں کی دوروزہ تقریب

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کے پہلے دو سالہ کنونشن کا رپورٹ

عمر مارچ کو جامعۃ الفلاح کے در و دیوار جگمگا اٹھے، ہر طرف ولولوں اور حوصلوں کی بہار نظر آنے لگی، طلبہ اور اساتذہ سرگرم، مستعد، انجانی مسرتوں میں غوطہ زن، آج نماز جمعہ کے بعد سے ابنائے قدیم کا اجلاس شروع ہو رہا ہے، ملک کے کونے کونے سے جامعہ کے سپوت پروانہ وار اڈے چلے آرہے ہیں، جمعہ کی نماز ختم ہوئی کہ مجلس سج گئی، مسجد اساتذہ و طلبہ سے بھر گئی، کرسیوں پر مہمانان خصوصی مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایڈیٹر برہان دہلی، اجناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایڈیٹر معارف اعظم گڈھ، ڈاکٹر اسعد اللہ صدیقی سکریٹری جنرل ایس آئی ایم، پروفیسر محمد محسن پرنسپل شبلی کالج اور محترم ابوالمجاہد زاہد صاحب، ناظم جامعہ مولانا ابو اللیث صاحب ندوی کے ہمراہ تشریف فرما ہیں۔

خطبۂ استقبالیہ پڑھا جا رہا ہے، مہمانان کی خدمت میں عقیدتوں اور محبتوں کے نذرانے پیش کئے جا رہے ہیں، ناظم اجتماع برادر اطہر ریحان کی آواز بھرائی ہوئی ہے، وہ اپنی خوشیوں پر قابو پانے میں ناکام ہو رہے ہیں، ان کے ساتھ ہی سامعین کی آنکھیں بھی نمناک اور اشکبار ہیں، تھوڑی دیر کے بعد سحر ٹوٹ جاتا ہے اور ناظم اجتماع اپنی نشست پر واپس جاتے ہیں، پھر انجمن طلبۂ قدیم کے معزز صدر برادر ابوالمکارم فلاحی مدنی اپنی گونج دار آواز میں خطبۂ صدارت پڑھتے ہیں، انجمن کے اغراض و مقاصد اس کی سرگرمیوں پر مختصر روشنی ڈالتے ہیں اور آنے والی صدی کو اسلامی صدی بنانے کے لئے عزم و تحمل کی تلقین کرتے ہیں، سکریٹری جنرل انصار احمد فلاحی اپنی دو سالہ رپورٹ میں انجمن کی کارکردگی، اس کے آرگن حیات نو اور طلبہ برادری کے سیماب صفت کارندوں سے متعارف کراتے ہیں، اور حیرت و تجسس اور تحسین و آفریں کے کلمات لے کر ہی واپس جاتے ہیں۔

آخر میں مہمان خصوصی مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایڈیٹر برہان دہلی جامعہ سے اپنے قلبی تعلق اور یہاں کی سرگرمیوں اور انجمن طلبۂ قدیم کی دو سالہ رپورٹ پر مسرت اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں:-

آپ نے فرمایا کہ آج پوری دنیا میں مسلم نوجوانوں کی ایک

تحریک شروع ہو چکی ہے جو اسلام کو غالب و نافذ دیکھنا چاہتی ہے، مصر و ایران، افغانستان و پاکستان اور دنیا جہان میں کفر و الحاد کے خلاف ایک کشمکش شروع ہو چکی ہے امت مسلم میں بیداری آ رہی ہے، اس نے اپنی حیثیت اور قیام و منصب کو پہچان لیا ہے، اب اشتراکیت و سرمایہ داری کا غلبہ کوئی دم بھر کی بات ہے۔

آپ نے بہت سے امور مفکرین مثلاً سید رشید رضا مصری، مفتی محمد عبدہ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبید اللہ سندھی، نائیجیریا کے احمد بلو شہید اور عالم اسلام کے ممتاز قائد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا،

آخر میں آپ نے ابنائے قدیم و جدید کو فرقہ بندی اور حسد سے بچنے اور خیر خواہی و اتحاد ملت کا علمبردار بننے کا پیغام دیا۔

اس نشست کے صدر مولانا ابواللیث صاحب ندوی نے معزز مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کیا، کنوینر کے فرائض برادر نسیم احمد غازی فلاحی نے انجام دیے۔

دوسری نشست

دوسری نشست نماز عشاء کے بعد شروع ہوئی اجلاس عام کا پروگرام تھا، سب سے پہلے مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی نے مختصر طور سے مہمان خصوصی ڈاکٹر احمد اللہ صدیقی، سکریٹری جنرل ایس آئی ایم کا تعارف کرایا اور انھیں اپنی گفتگو کا موقع دیتے ہوئے درمیان سے ہٹ گئے۔

برادر احمد صاحب نے اپنی گفتگو کی تحریر میں مسلم طلبہ اور نوجوانوں کو ملک کی تعمیر میں اپنا بھرپور رول ادا کرنے کی دعوت دی، اور مغربی تہذیب کی جھوٹی خیرہ کن چمک کو بے نقاب کیا اور اسلامی تہذیب و تمدن کے دلکش و دیدہ زیب پہلوؤں کو نکھار کر پیش کیا۔ صحیح بات تو یہ تھا، ایک تو جوانی دوسرے خلوص و محنت اور جہاد و قربانی ان دونوں نے مل کر تقریر کو شعلۂ جوالہ بنا دیا، اختصار و افراط شدہ کسی شمارے میں تقریر کا مکمل متن آ سکے گا۔

کنوینر برادر ابوالمکارم فلاحی تھے۔

۴ر مارچ

نماز فجر کے بعد درس قرآن کا پروگرام تھا، اور مولانا جلیل احسن ندوی مدظلہ العالی اپنے مخصوص و منفرد انداز میں درس دے رہے تھے، اسلامی تحریک میں نوجوانوں کا رول اجاگر کر رہے تھے، اصحاب کہف، قصۂ موسیٰ و فرعون کے دلکش و عبرتناک پہلوؤں کو پیش کر رہے تھے، دوران درس نوجوانوں کے دلوں میں اسلامی انقلاب کی آرزوئیں اور تحریک اسلامی کی کامیابی کی تمنائیں کروٹیں لے رہی تھیں۔

آپ نے فرمایا کہ قرآن شاہد ہے کہ ہر دور میں تحریک اسلامی کی دعوت پر لبیک کہنے والے اور اس کی راہ میں ہر قسم کی قربانی دینے والے یہی نوجوان رہے ہیں، چاہے وہ غار کا واقعہ ہو، معرکۂ کلیم و فرعون درپیش ہو یا بدر و احد اور احزاب کے معرکے ہوں، ہر مرحلہ پر قرآن کے بیان کے مطابق نوجوانوں نے ہی سبقت کی ہے، آج بھی تحریک اسلامی کو انھیں دیوانوں اور سرفروشوں کی ضرورت ہے۔

کنوینر برادر اصفا احمد فلاحی تھے۔

دوسری نشست

دوسری نشست جامعۃ الفلاح کے طلبہ کے لئے مخصوص تھی، سالانہ امتحان ۱۹۷۹ء میں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے مبارک ہاتھوں سے

بہ شکل کتب انعامات حاصل کر رہے تھے، یہ انعامات انجمن طلبۂ قدیم کی طرف سے دیے گئے۔ انعامات کی فہرست یوں ہے:

درجہ چہاردہم :-

شارق انصار اللہ — اول — ۷۰/-
حفیظ الرحمٰن — دوم — ۵۵/-
مظہر الحق — سوم — ۴۵/-

درجہ سیزدہم :-

زین العابدین — اول — ۷۰/-
صباح الدین — دوم — ۵۵/-
اوصاف احمد — سوم — ۴۵/-

درجہ دوازدہم :-

مظفر اسلام — اول — ۴۰/-
ظہیر احمد — دوم — ۳۵/-
جاوید احسن — ۳۰/-

درجہ یازدہم :-

ابوالکلام — اول — ۴۰/-
محمد یونس — دوم — ۳۵/-
معین الدین — سوم — ۳۰/-

درجہ دہم :-

عبداللہ مرزا پوری — اول — ۳۰/-
راشد حامدی — دوم — ۲۵/-
سمیع اختر — سوم — ۲۰/-

درجہ نہم :-

زبیر احمد — اول — ۳۰/-
فضیل اقدس — دوم — ۲۵/-
شکیل احمد — سوم — ۲۰/-

درجہ ہشتم :-

عطاء اللہ — اول — ۳۰/-
عبدالحی فاروق — دوم — ۲۸/-
غفران احمد — سوم — ۲۰/-

درجہ ہفتم :-

پرویز عالم — اول — ۱۵/-
جاوید اقبال — دوم — ۱۲/-
طارق انور — سوم — ۱۰/-

درجہ ششم :-

جلال الدین — اول — ۱۵/-
شمشاد عالم — دوم — ۱۲/-
محمد ارشد — سوم — ۱۰/-

درجہ پنجم :-

عبدالبر — اول — ۱۵/-
عابد حسین — دوم — ۱۲/-
محمد طارق — سوم — ۱۰/-
عبداللہ ترابی — " — ۱۰/-

درجہ چہارم :-

محفوظ الرحمٰن جاوید — اول — ۱۰/-
الیاس احمد — دوم — ۸/-
ذوالفقار احمد — سوم — ۶/-

درجہ سوم :-

نوشاد احمد — اول — ۱۰/-
اصغر احسن — دوم — ۸/-

محمد شاہد	سوم	۶/-
درجہ دوم :-		
شعیب احمد	اول	۱۰/-
نسیم احمد	دوم	۸/-
صلاح الدین	سوم	۶/-
درجہ اول :-		
جاوید عالم سوان	اول	۵/-
محمد اعظم سوان	دوم	۳/-
شہاب الدین	سوم	۲/-
درجہ اطفال :-		
شہاب الدین	اول	۵/-
عبد النور	دوم	۳/-
مصلح الدین	سوم	۲/-

مدرسۂ نسواں

درجہ نہم :-		
ساجدہ بانو	اول	۳۰/-
قیصر جلیل	دوم	۲۵/-
نزہت بانو	سوم	۲۰/-
درجہ ہشتم :-		
فہمیدہ	اول	۳۰/-
الماس جہاں	دوم	۲۵/-
شاہجہاں	سوم	۲۰/-
درجہ ہفتم :-		
آسیہ بانو	اول	۱۵/-
نور الصباح	دوم	۱۲/-
جمیلہ خاتون	سوم	۱۰/-
درجہ ششم :-		
صالحہ تبسم	اول	۱۵/-
نجمہ جلیل	دوم	۱۲/-
نجم السحر	سوم	۱۰/-
درجہ پنجم :-		
سعیدہ بانو	اول	[illegible]/-
نور جہاں	دوم	۳/-
بشریٰ	سوم	[illegible]/-
درجہ چہارم :-		
ارجمند بانو	اول	[illegible]/-
قیصری بانو	دوم	۸/-
راحلہ بانو	سوم	۶/-
درجہ سوم :-		
شبنم بانو	اول	۱۰/-
انجم آرا	دوم	۸/-
شگفتہ	سوم	۶/-
درجہ دوم :-		
تحسین بانو	اول	۱۰/-
ریحانہ بانو	دوم	۸/-
تسنیم فرحت	سوم	۶/-
درجہ اول		
افروز بانو	اول	۵/-
عشرت بیگم	دوم	۳/-
سلمیٰ بانو	سوم	۲/-

اس مبارک موقع پر درج ذیل طلبہ وطالبات کو خصوصی انعامات دیے گئے :-

۱ - بہترین طالب علم — عطاء اللہ گیاوی (عربی اول)
۲ - بہترین صحت — خورشید عالم اعظمیہ (درجہ ہفتم)
۳ - بہترین اخلاق — ابو الکلام (درجہ عربی پنجم)
〃 — صالحہ تبسم (درجہ ہفتم نسواں)
۴ - بہترین مقرر — صباحۃ الدین (عربی ہفتم)
〃 — خالدہ انوری (عالمہ سوم)
۵ - بہترین کھلاڑی — سراج احمد (عربی چہارم)

اس نشست کے صدر مولانا عبدالحبیب صاحب اصلاحی تھے۔ کنوینر کے فرائض مشرف حسین صدیقی فلاحی نے انجام دیے۔

عزیزانِ جامعہ سے پروفیسر محمد محسن صاحب پرنسپل شبلی کالج اعظم گڑھ اور جناب شبنم سبحانی صاحب نے بھی خطاب کیا، پروفیسر صاحب نے پندرہویں صدی ہجری کو اسلامی صدی بنانے کے لئے عزیزان جامعہ کو نصیحت کی کہ آپ دین کا پیغام گھر گھر اور قریہ قریہ پہنچائیں، محنت، جد وجہد اور لگن کے ساتھ اس کام میں لگ جائیں، جناب شبنم صاحب نے غیر اسلامی نظریات اور افکار کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری تیاری کرنے اور اپنے آپ کو اخلاق و ایمان سے مسلح کرنے کی طرف اشارہ کیا۔

تیسری نشست

۲ بجے سے تیسری نشست کا آغاز ہوا، اس وقت مذاکرہ کا پروگرام تھا، عنوان تھا "گیارہویں صدی ہجری اسلامی صدی ہوگی"۔ اس موضوع پر دلچسپ مذاکرہ ہوا جس میں تفصیل آگے آئے گی، صدارت مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب نے کی، کنوینر برادرم اطہر ریحان فلاحی تھے۔

چوتھی نشست

عشاء بعد ادبی نشست منعقد ہوئی، جناب حفیظ میرٹھی، شبنم سبحانی، ابوالمجاہد زاہد کے علاوہ مقامی شعراء کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی، منتخب غزلیں آئندہ شماروں میں آتی رہیں گی۔

۹ مارچ کو ممبران انجمن کی میٹنگ بصدارت کیلئے مولانا ابوالمکارم صاحب فلاحی کی توثیق کی گئی، مجلس شوریٰ میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں نئے انتخابات کے مطابق۔

۱ - انصار احمد فلاحی (بلریا گنج اعظم گڑھ) سکریٹری جنرل اور
۲ - نور محمد فلاحی (جامعۃ الفلاح) خازن ہیں۔ اور مجلس شوریٰ کے ممبران یہ ہیں :-

۱ - ڈاکٹر ابرار احمد فلاحی چاند پٹی اعظم گڑھ
۲ - شفیق عالم فلاحی سیشیو رانچی، بہار
۳ - مشرف حسین صدیقی فلاحی، صدیقی منزل، زینہ عنایت خاں، رام پور، یوپی۔
۴ - نسیم احمد غازی فلاحی، مرکز جماعت اسلامی ہند بازار مفتی کفایت اللہ دہلی ۶ -
۵ - شبیر احمد فلاحی 〃 〃 〃 〃
۶ - اطہر ریحان فلاحی، طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ -
۷ - عبدالسلام فلاحی، اسلامک پبلشرز دو محلہ روڈ، رامپور
۸ - محمد عمران فلاحی، بلریا گنج، اعظم گڑھ
۹ - اشتیاق دانش فلاحی، ایڈیٹر خبرنامہ، ام عبدالقادر مارکیٹ جیل روڈ، علی گڑھ -
۱۰ - عبداللہ فہد، جامعۃ الفلاح -

بقیہ...

ابو محمد امام الدین رام نگری

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اور

مجددیت

صحیح عنوان تو "مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی مجددیت" تھا، لیکن ہم نے یہ عنوان نہیں دیا کیونکہ اگر سارا عالم اسلام مولانا مودودیؒ کو نظام اسلامی کے قیام کا محرک و داعی مانتا اور ان کی مدح و ستائش کرتا ہے تو ہندو پاک میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جس کو مولانا مودودی کی یہ عظمت گوارا نہیں، وہ ہر عظمت و بزرگی کو اپنا حق سمجھتا ہے، وہ ہمارے دوسرے عنوان پر ناک بھوں سکوڑتا، وہ ہر طرح سے مولانا مودودی کے متعلق افترا پردازی اور تہمت تراشی کرتا ہے، اور کہتا رہا ہے کہ مودودی تو مجدد اور امام مہدی بننا چاہتے ہیں۔

ایک بار ایک شخص نے مولانا مودودی کے پاس چند اعتراضات لکھ کر بھیجے تھے اور ان کا جواب طلب کیا تھا، اس نے لکھا تھا:- "چند حضرات جو نہایت مخلص اور دیندار ہیں، تجدید و احیائے دین کی ان سطروں سے متعلق جو آپ نے امام مہدی کے متعلق تحریر فرمائی ہیں، احادیث کی روشنی میں اعتراضات پیش کر رہے تھے، میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں،

احادیث نقل کرکے آخر میں لکھا تھا:-

"کتاب علامات قیامت مولانا رفیع الدین صاحب (محدث دہلویؒ) مترجمہ مولوی محمود صاحب میں امام مہدی کے متعلق مسلم و بخاری کے حوالے سے چند روایات درج ہیں لیکن تحقیق کرنے پر مسلم و بخاری میں مجھے اس قسم کی کوئی حدیث نہ مل سکی، اسی کتاب میں ایک حدیث یہ بھی درج ہے کہ بیعت مہدی کے وقت آسمان سے یہ ندا آئے گی "هذا خليفة الله المهدي فاستمعوا له واطيعوا" اس روایت کے متعلق آپ کی تحقیق کیا ہے؟"

اسی سلسلے میں مستفسر نے لکھا ہے:-

"جناب کی ان سطور سے کہ وہ (امام مہدی) جدید طرز کا لیڈر ہوگا، یہ شبہ کیا جا رہا ہے کہ آپ خود امام مہدی ہونے کا دعویٰ کریں گے۔"

مولاناؒ نے ان تمام سوالوں کا شافی جواب تحریر فرمایا، اس شبہ کا جواب کہ مولانا خود مہدی ہونے کا دعویٰ کریں گے

ہم نیچے نقل کر رہے ہیں ۔

"یہ ارشاد کہ اس سے شبہ کیا جا رہا ہے کہ
خود امام مہدی ہونے کا دعویٰ کرے گا ،
اس کے جواب میں بجز اس کے کچھ عرض نہیں
کر سکتا کہ اس قسم کے شبہات کا اظہار کرنا ،
کسی ایسے آدمی کا کام تو نہیں ہو سکتا جو خدا سے
ڈرتا ہو جسے خدا کے سامنے اپنی جواب دہی
کا احساس ہو ، اور جس کو اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت
بھی یاد ہو " اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ
بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ " جو حضرات اس قسم کے
شبہات کا اظہار کر کے بندگانِ خدا کو جماعت
اسلامی کی دعوتِ حق سے روکنے کی کوشش فرما
رہے ہیں ، میں نے ان کو ایک ایسی سزا دینے کا
فیصلہ کیا ہے جس سے وہ کسی طرح رہائی حاصل
نہ کر سکیں گے ۔ اور وہ سزا یہ ہے کہ انشاء اللہ
میں ہر قسم کے دعووں سے اپنا دامن بچائے
اپنے خدا کے حضور حاضر ہوں گا ، پھر دیکھوں گا
کہ یہ حضرات خدا کے سامنے اپنے شبہات
اور ان کو بیان کر کے لوگوں کو حق سے روکنے
کی کیا صفائی پیش کرتے ہیں ۔"

(ترجمان القرآن جلد ۳۹ ، عدد ۱)

مخالفین حضرات مواخذۂ آخرت سے اس قدر بے خوف
تھے کہ مولانا مودودی کے اس انتباہ کے بعد بھی افترا پردازی
و الزام دہی سے باز نہ آئے ، اس قسم کا ایک شدید یہ بھی پھیلاتے
رہے کہ آپ مجدد ہونے کا دعویٰ کریں گے ۔
اس افترا میں ایک بڑی حقیقت مخفی ہے ، مخالفین
جانتے ہیں کہ کوئی شخص کیسے کام کرتا ہے تو وہ مجدد کہلاتا ہے
وہ دیکھتے تھے کہ یہ شخص کام تو ایسے ہی کر رہا ہے جو مجددِ دین
کے کرنے کا ہے ، اس لئے ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر
یہ مجدد مانا جانے لگے ، مولانا مودودی کو اللہ تعالیٰ نے
جو فکر و فہم دی تھی ، وہ مخالفین میں کسی میں نہ تھی ، مولانا
کے قلم اور ان کی زبان میں جو تاثیر دی تھی ، وہ کسی کے قلم
اور زبان میں نہ تھی ، خدا کی زمین پر خدا کے دین کو برپا کرنے
کی مولانا کے دل میں جو لگن تھی ، وہ لگن کسی کے دل میں نہ تھی
اس مقصد کے لئے آپ میں جو عزم و حوصلہ اور جذبۂ ایثار
و قربانی تھا وہ کسی میں نہ تھا ، آپ کے ایسا دلوں کو کفر و الحاد
اور مادہ پرستی سے اسلام اور خدا پرستی کی طرف پھیر دینے
والا لٹریچر کسی کے پاس نہ تھا ، تحریکِ اسلامی کی دعوت
کے لئے اور اسے چلانے کے لئے جیسی صلاحیت مولانا میں
تھی کسی میں نہ تھی ۔ مخالفین میں اسلامی مدارس کے بڑے بڑے
کے مہتمم تھے ، اصحابِ درس و افتاء تھے ، شیوخ طریقت و
ارشاد تھے ، ان کے تلامذہ و معتقدین ملک بھر میں پھیلے
ہوئے تھے ... مولانا مودودی کو کسی باقاعدہ حصولِ تعلیم کا
موقع بھی نہ ملا تھا ، نہ ان کے اوپر کوئی معاون تھا ، نہ
پیچھے ان کے معتقدین اور خود ایسی اپیل رکھتا رہے تھے ،
انھوں نے ایک جماعت کیسے منظم کر لی ، اور وہ روز بروز
ترقی کیسے کرتی چلی گئی جس کی رفتار کو مخالفین کے فتوے اور
کتابچے نہ روک سکے اور سارے عالم اسلام نے ان کو
اسلامی نظام کی تحریک کا بانی اور علمبردار مان لیا ، ان کی
اٹھائی ہوئی آواز عالم اسلام کے ہر اسلام پسند کے دل کی
پکار کیسے بن گئی ، ہر صاحبِ بصیرت اسے مانے گا کہ مولانا
مودودی کو مشیتِ ربانی نے اس کام پر مامور کیا تھا ۔

این سعادت بزور بازو نیست

مولانا مودودی کو نہ مجددیت کا دعویٰ کرنے کی ضرورت تھی، نہ انھوں نے اس کا دعویٰ کیا، خدا نے جس کام پر ان کو لگا دیا تھا، آخر دم تک اس کام میں جان کھپاتے رہے، یہاں تک کہ اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔ والحمد للہ۔ ہمیں جہاں تک معلوم ہے کسی مجدد نے مجددیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی مجددوں میں شمار ہوتا ہے، شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ اللہ کی ایک نشانی تھے، انھوں نے بھی متکلم ہونے کا دعویٰ تو کیا، مگر مجددیت کا دعویٰ نہیں کیا، شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اور سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ مجدد مانے جاتے ہیں، انھوں نے کبھی مجدد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، مسلمانوں نے خود ان بزرگوں کو مجدد مان لیا۔

درحقیقت مجددیت ایک خداداد منصب ہے، جو اللہ اس منصب کے لئے جس کو منتخب کر لیتا ہے، وہی مجدد ہوتا ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کی ایک کتاب "تذکرہ" ہے، اس میں انھوں نے اپنے ابتدائی اور خاندانی حالات لکھے ہیں، اسی سلسلہ میں مختلف قسم کے علوم اور مباحث آگئے ہیں، انہی میں ایک بحث مجددیت کی بھی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ کس پایہ کے بزرگ تھے، مگر وہ مجدد نہ ہوسکے، ان کی اولاد میں بڑے بڑے علماء تھے، ان میں بھی کوئی مجدد نہ ہوا، یہ منصب تھا سید احمد شہید بریلوی کا، حالانکہ علم و فضل کے اعتبار سے ان حضرات کے مقابلہ میں سید صاحب کی کوئی حیثیت نہ تھی، وہ شاہ عبد العزیز کے مرید اور فیض یافتہ تھے، لیکن مجددیت کا شرف ان کو حاصل ہوا۔ علم و فضل کے اعتبار سے موجودہ زمانے کے علماء و فضلاء کے مقابلے میں بھی حیثیت مولانا مودودی کی تھی، اگر اللہ تعالیٰ کو ان سے تجدید دین کا کام لینا تھا اور اس نے ان کو اس کام کی صلاحیت عطا کی، اور ان کو توفیق و ہدایت دی تو وہ مجدد کیوں نہیں ہو سکتے، انھوں نے تجدید و احیاء دین کا جو نقشہ بنایا، اس کے لئے جیسا لٹریچر لکھا، جس طرح اس کے لئے زمین تیار کی، جس طرح کی جماعت کی طرح ڈالی، اور اس کے لئے جو طریقہ کار متعین کیا اور جس طرح اس تحریک و دعوت نے عالمگیر شہرت و مقبولیت حاصل کی، ان سب چیزوں کا جو شخص غائر نظر سے مطالعہ کرے گا، وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا کہ مولانا مودودی نے خدا کی تائید سے تجدید کا کارنامہ انجام دیا۔

مولانا مودودی کے کام کی اہمیت سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جس زمانے میں انھوں نے اپنے کام کا آغاز کیا

اس زمانے میں اسلام اور مسلمانوں

انگریزی حکومت کے اثر سے مسلمانوں میں مغربی تہذیب نفوذ کر چکی تھی، انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کے اندر الحاد و دہریت پیدا ہو گئی تھی، مختلف قسم کی اصطلاحیں رائج ہو گئی تھیں، روشن خیال، تنگ نظر، ترقی پسند، رجعت پسند۔ دیندار مسلمان تنگ خیال، تنگ نظر اور رجعت پسند سمجھے جاتے تھے، اسلام کی عظمت اور حقانیت دین کی قدر دلوں میں کم ہو گئی تھی، مسلمانوں کی عام زندگی سے اسلام کا رشتہ کٹ چکا تھا، نماز روزہ اور چند مذہبی رسوم تک کا تعلق باقی تھا، زندگی کے باقی معاملات اتباع اسلام سے آزاد تھے، جدید تعلیم یافتہ و روشن خیال مسلمانوں کے نزدیک نماز روزہ کار عبث تھے، ہندوستان کی آزادی

کی تحریک چل رہی تھی، مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے تھے ایک مسلم لیگ میں تھا اور دوسرا حصہ کانگریس میں، ایک حصہ مسلم لیگی کہلاتا تھا اور دوسرا قوم پرست، دونوں حصوں کی راہیں جدا تھیں، جیسے دونوں دو ملتیں ہوں، جمعیۃ العلماء قائم تھی جس کے رہنما بڑے بڑے علماء تھے، جمعیۃ کانگریس کی ہم نوا اور شریک کار تھی، اور اس کا شمار بھی قوم پرستوں میں تھا، مسلم لیگی رہنما، اسلامی حکومت کا نام لیتے تھے اور مسلمانوں کو اسلامی حکومت کے نام پر بلاتے تھے، لیکن وہ اسلامی نظام حکومت سے یکسر نا آشنا تھے یہ بات تصور سے بھی بعید تھی کہ ایسے ہنگامہ خیز اور خلفشار کے زمانے میں اسلامی نظام کے قیام کی تحریک رونما ہوگی اور اس کے داعی کی پکار سنی جا سکے گی اور تحریک جاری بھی ہوگی، لیکن بعید از تصور یہ سب کچھ ہوا، اس ہنگامے اور خلفشار میں والی تحریک کی پکار پر لبیک کہنے والے بھی پیدا ہو گئے، اور تحریک جاری بھی ہو گئی، کیا عقل کہتی ہے کہ اس کا مفکر، بانی اور داعی، عام مسلمانوں یا عام علمائے دین کی طرح کا ہی ایک مسلمان یا عالم دین تھا؟

اب ایک نظر اس طریقہ کار پر ڈالئے جسے مولانا مودودی نے اس تحریک کو چلانے کے لئے وضع کیا ایسا لٹریچر لکھا جسے مطالعہ کر کے ہر شخص سمجھ لیتا تھا کہ اس تحریک کا مقصد کیا ہے اور وہ کیا چاہتی ہے۔ اس تحریک کو قبول کرنے والے کے اعمال و فرائض کیا ہیں زندگی کو اس تحریک کے مطابق بنانے کے لئے کیا اختیار کرنی پڑے گی اور کیا چیز چھوڑنی پڑے گی

انھوں نے تحریک کو قبول کرنے والوں کو منظم کرنے کے لئے جماعت کی تشکیل کی اور اس کے لئے اجتماع کا طریقہ رائج کیا تاکہ جماعت کے ارکان ایک جگہ جمع ہوا کریں، لٹریچر کا اجتماعی مطالعہ کریں، قرآن و حدیث کا درس ہو، تحریک کو پھیلانے کے لئے باہم مشورہ کریں، جماعت کی نگرانی اور ارکان کے اعمال و اخلاق کی تربیت کے لئے ایک امیر کے تقرر کا طریقہ مقرر کیا جسے ارکان اپنے میں سے خود باہمی مشورے سے منتخب کر لیں، گویا جماعت خود اسلامی نظام کا ایک نمونہ ہو، مسلمانوں میں اسلامی نظام کے لئے اس انداز کی نہ کبھی کوئی تحریک اٹھی اور نہ ایسی جماعت قائم ہوئی، ایک بے پناہ غیر مسلم اکثریت کے ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی تحریک و دعوت کے اس طریقہ کار کے سوا کوئی دوسرا طریقہ ممکن ہی نہیں ہے۔

بے محل نہ ہوگا اگر ایک نظر مجددین پر ڈال لی جائے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانۂ خلافت میں دین قائم تھا، خرابیاں اعیان و امراء اور ان کے اعزہ کے اعمال و اخلاق میں تھیں، امیر المومنین نے بحیثیت خلیفہ ان کی خرابیوں کو دور کیا، حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو کبھی حکومت وقت میں رسوخ حاصل تھا، انھوں نے دہریوں اور [illegible] کے ان اعتراضوں کا جواب دیا جو وہ اسلامی عقائد پر کیا کرتے تھے، ہندوستان میں مجدد کبیر حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اکبر کے زمانۂ حکومت میں بد دین فیضی اور ابوالفضل اور دنیا پرست علماء کی پھیلائی ہوئی ضلالتوں اور بدعتیوں کو دور کیا، شاہی نظام حکومت کے بجائے اسلامی نظام کا قیام ان کا مقصد تھا، لیکن انھیں

کی تجدید پچھلی کا کارنامہ رہا ہے۔ ان کی بدولت ہم اسلام کی شمع فروزاں دیکھ رہے ہیں ورنہ نہیں کہا جا سکتا کہ آج اسلام کی کیا صورت ہوتی۔ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام اور ملت اسلامیہ کے احیاء و تحفظ کے لئے مجاہدین کی ایک جماعت تیار کی اور عملی جہاد کیا اور اسی راہ میں شہید ہو گئے۔ مجددین میں ان کو یہ خاص امتیاز حاصل ہے

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

سید شہید کی تحریک دنیا پرست مسلمانوں کی غداری سے ناکام ہو گئی لیکن انکی یادیں آج بھی مسلمانوں کے دل میں گرم ہیں

زندۂ جاوید ہیں تیغ محبت کے قتیل
یہ خبر [illegible]

موجودہ زمانہ نظام اسلامی کے قیام کے اعتبار سے [illegible] یہ ہے [illegible] مسلمانوں میں تحریک چلا کر یہاں اسلامی نظام کے قیام کا کوئی امکان نہیں کیونکہ غیر مسلموں کی تعداد کے اعتبار سے مسلمان انتہائی اقلیت میں ہیں اور ان کی بھی بیشتر آبادی اسلام کی پابند نہیں۔ اس ملک میں اسلامی نظام کا قیام اسی صورت میں ممکن اور متوقع ہے کہ غیر مسلموں کو اسلام سے متعارف کرایا جائے، ان کے ذہن کو اسلام کے حق میں ہموار کیا جائے، ان کو اسلام سے قریب لایا جائے اور ان کی خاصی تعداد اسلامی نظام کے فوائد و برکات سے متاثر ہو کر اسلامی نظام کے قیام کی حامی ہو جائے۔ اس لئے مولانا مودودی کو کوئی راہ کھلی ہوئی [illegible] جماعت اسلامی کی دعوت کے مخاطب مسلمان ہی نہیں

[illegible] میں [illegible] کے ذریعہ اور سیمینار وغیرہ انعقاد کر رہے ہیں، اسکے ذریعہ غیر مسلموں کو [illegible] و ضرورت دین [illegible] ملک کی متعدد زبانوں میں اسلامی لٹریچر شائع ہو رہا ہے اور [illegible] تک پہنچ رہا ہے، مختصر یہ اس سلسلے میں [illegible] درست ہیں، کیا مولانا مودودی کی تحریک و دعوت کا یہ انداز و منہج ان کو منفرد اور مجدد ثابت نہیں کرتا۔ کوئی ان کو مجدد مانے یا نہ مانے، ان کے کاموں کا اعتراف کرے یا انکار، انہوں نے جو کام کئے ہیں وہ ان کو بطور مجدد ثابت کرتے ہیں۔ کسی کو یہ خیال نہ ہونا چاہئے کہ ہمارا یہ فیصلہ عقیدت مندی پر مبنی ہے۔ ہم تو حجۃ الاسلام [illegible] اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے معتقدین میں سے ہیں۔ ہم نے تو تجزیہ [illegible] واقعات و حقائق پر گفتگو کی ہے۔ ہم واقعات و حقائق کا انکار کیسے کر دیں؟ ہم ہی تنہا نہیں، کچھ دوسرے لوگ بھی اسی نہج پر سوچ رہے ہیں اور اظہار خیال کر رہے ہیں۔ محمد صلاح الدین صاحب سابق ایڈیٹر المدینہ، جدہ نے اپنے مضمون میں مولانا مودودی کو مجدد و امام لکھا ہے جو ۱۴ ذوالقعدہ ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۹ء کے "المدینہ" میں شائع ہوا ہے۔ دیکھئے صلاح الدین صاحب کے مضمون کے اقتباسات

۱- صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سعد بن معاذ کی موت پر عرش لرز گیا۔ ایک سے زیادہ روایات میں یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ علماء کی موت امت کے لئے بڑا خسارہ ہوتی ہے اور یہ ایک ایسی زبردست چوٹ ہے جو امت کے جسم کو لگتی ہے؟

انھیں معنوں میں اس امت کے عالم اور اس زمانہ کے مجدد
سید ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات جو ان معنوں میں کی
حق تقصیر ہے ۔ اس پر تمام حلقوں کو رنج ہوا۔
سانحہ ایک ایسے نازک اور خطرناک وقت پر واقع ہوا
جب کہ یہ امت ان کے علم، ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں
کی سخت ضرورت مند تھی ۔

۳ - عالم اسلام لاتعداد علماء سے بھرا ہے
اگر علم کو محض علم اور درایت کے معنی میں لیا جائے
اور اگر علم کا اطلاق صرف رسمی سندوں پر کیا جائے
جو کسی علمی مرکز میں چند برس گزارنے کی دلیل ہیں
تو پھر ایسے سند یافتہ لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے،
اس کے برعکس اگر علم سے مراد وراثت انبیاء اور
رسل ہے اور نصرت حق اور باطل سے نتیجہ آزمائی
ہو، اور مسلمانوں سے قلبی لگاؤ اور روحانی تعلق ہو
یہ لامحدود تعداد ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے اور ان
صفات کے حامل بہت ہی کم علماء رہ جاتے ہیں
جن کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے اور جن
کی ریاست و صدارت کا شرف ابوالاعلیٰ مودودی
کو حاصل ہے ۔

اگر علم کے معنی شریعت کو خواہشات نفس کا کھلونا
بن جانے سے محفوظ رکھنا ہے اور مسلمانوں کو طاغوت
کے پھندے سے بچانا ہے، اور احکام اللہ کو اسی
طرح نافذ کرنا ہے جیسا کہ اللہ نے ان کو اپنے نبی پر
نازل فرمایا اور جیسا کہ سلف صالحین نے ان کو
اپنی زندگیوں میں رچایا بسایا تھا تو ہزاروں لاکھوں
چہرے خود بخود غائب ہو جاتے ہیں، اور اس سطح پر
صرف چند چہرے چمکتے دمکتے جلوہ افروز رہتے ہیں،
جن میں سب سے روشن اور منور چہرہ مودودی ہی کا ہے ۔

اگر علم سے مراد کفاف کی زندگی، عزت نفس، مردانہ
خودداری، انبیاء کرام کا زہد و انکسار اور قیادت کی
جاں نثاری اور جاں فروشی ہے تو آپ مودودی کو
پہاڑ کی چوٹی پر پائیں گے، باقی سب لوگ سطح ارض
پر پڑے ہوئے نظر آئیں گے ۔

۴ - مودودی اس صدی میں امام تھے اور عصر حاضر میں
بلا جدال مجدد تھے ۔"

(ترجمہ حامد عبدالرحمٰن الکاف ... ماہنامہ ... نومبر ۱۹۷۹ء)

بقیہ صفحہ ... سے

تھی مجلس شوریٰ کی میٹنگ ہوئی جس میں سکریٹری ... اور رفقاء کی کارکردگی
عمل میں آئی، انصار احمد خلجی کو نائب ... ناظم اور سید ... کو مدیر
بنایا گیا، مجلس شوریٰ نے انجمن کی سالانہ رپورٹ پر غور و خوض کیا گذشتہ
بجٹ کی روشنی میں آمد و صرف کا جائزہ لیا، حیات نو کی مالی حالت
کو مستحکم بنانے کیلئے طے کیا گیا کہ: - ★ جہاں کہیں زائد ممبر انجمن ہوں،
وہاں باہمی رابطہ کیلئے نظم قائم کیا جائے، کسی ایک کو ذمہ دار بنا دیا جائے
تاکہ وہ تمام ممبران سے چندہ احیاء سے جمع کر لے، اعانتیں وصول کرکے
مرکز کو بھیجا کرے ۔ ★ حیات نو کے خریدار بڑھانے کیلئے ہر ممکن جد و جہد
کی جائے اور ہر حلقے میں اسے پہنچانے اور ہر ایک سے مالی اعانتیں وصول
کرنے کی کوشش کی جائے ۔ ★ یہ بھی طے پایا کہ جامعہ سے فارغ ہونے والا
ہر طالب علم انجمن کا ممبر بننے کیلئے داخلہ فیس ۔/۱ لازمی جمع کرے
اور پھر ہر سال کم از کم دس روپئے کی اعانت کرتا رہے لیکن اعانت ادا
نہ کرنے کی صورت میں اسے انجمن سے خارج سمجھا جائیگا ۔

بقیہ: مکتوب فرقانی بنام مولوی منظور نعمانی

زبان میں مولانا مرحوم کی تصانیف کوئی خاص شہرت نہیں رکھتیں کیا یہ تصانیف قرآن و حدیث سے ہٹ کر دو شاہراہِ ہدایت کو مسدود کر سکنے والی کوشش نہیں ہیں۔ اگر آپ کا خیال ایسا ہے تو یہ بڑا غلط ہے اور آپ جرمِ باطل میں مبتلا ہیں۔ کیا میں آپ سے معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کا سرمایۂ علم کیا ہے اور یہ کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ کیا آپ کے سرمایۂ علم یا اس کا حاصل، کا فیض اشاعت اور قدر و قیمت سے زیادہ ہے؟ — محترم! آپ کس سرمایہ کی بات کرتے ہیں۔ کاش ہمارا سرمایہ مولانا مودودی کی تصانیف کا کوئی ہوتیں تو ہم کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوتے اور مغربی تہذیب ہوتی یہ تصانیف آپ جیسے عالم کی نہیں، بلکہ اس شخص کی ہیں جس نے لکھنے سے قبل لائبریریاں اپنے ذہن میں اتار لی تھیں۔ جس نے ہندوستان کی مختلف درسگاہوں میں زانوئے تلمذ کرنے کے علاوہ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں سے ڈگریاں لیں اور کئی سال سے ایک یونیورسٹی میں لیکچرر ہوں بلکہ اس وقت صدر شعبہ کے عہدہ پر فائز ہوں اور لندن یونیورسٹی سے شرق اوسط علم القرآن کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل دنیا کی یونیورسٹی کے علماء، اسکالروں اور پروفیسروں سے اور بحث مباحثہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مگر میں نے کسی کو بھی مولانا مودودی سے کم تر کا نہ پایا۔ میرا خیال ہے کہ جس نے بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا وہ مولانا مودودی کی تصانیف کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مولانا مرحوم جیسی ایک سطر بھی لکھنے سے عاجز ہیں۔ مولانا کی تصانیف کے ترجمے دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکے ہیں اور دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے انگریزی اور ... ہیں یونیورسٹیوں اور پبلک لائبریریوں کی زینت۔۔۔ کاش آپ

ٹھنڈے دل سے سوچیں اور فیصلہ فرمائیں کہ آپ کس کے خلاف قلم اٹھا رہے ہیں۔ کیا آپ سورج کی تابناک شعاعوں میں دھول پھینک کے اور آسمان پر تھوک کے جیسے عمل کے مترادف عمل کا ارتکاب نہیں کر رہے ہیں۔

کتنوں کو جانتے آپ نے کافر بنا دیا جو مسلم تھی کو آپ بنا کر تو جانتے

امید ہے آپ اپنا قیمتی وقت ... اور فضول بحث و مباحثہ میں ضائع کرنے کے بجائے امت اسلامیہ کی ترقی، یکجہتی اور خلوص صداقت پر صرف فرمائیں گے۔ اگر کسی کی توجہ آپ مولانا مودودی سے کوئی عناد رکھتے ہیں جب بھی آپ کو امت کے اس بڑے عالم پر تنقید سے پہلے سوچنا اور قلم اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور مرحوم لوگوں کے خلاف ... کرنا تو بہت ہی بڑا جرم ہے اور احادیث میں اس کی سخت ممانعت ہے۔ محترمی! اگر آپ یہ بات کہ مولانا مودودی سے زیادہ قابل، لائق، متقی اور پرہیزگار ہونے کا اسلام کا خادم یقین کرتے ہیں مگر اس کے باوجود آپ کو وہ دنیاوی عزت نہیں مل رہی ہے جو مولانا مودودی کو ملی تو میں جیسے کی زبان میں یہی کہوں گا کہ اس کا فیصلہ آپ کے خیالات سے ہو جائیگا۔ موت تو برحق ہے، ہم سب کو ایک دن جانا ہے، دنیا نے مولانا مودودی کے جنازے کے مناظر دیکھے اور دیکھے اور آپ کا بھی ہو گا، زندہ رہیں گے دیکھ لیں گے۔ آئیے ہم اور آپ مل کر اسلام کی خدمت کا فریضہ اپنے ہاتھ میں لے لیں اور اسلامی پرچم کو بلند کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دیں کیونکہ دنیا و آخرت کی سرخروئی اسی میں مضمر ہے۔

آپ کا مخلص

حبیب احمد جمالی (زمانی)

احمدو یونیورسٹی — زاریا — نائیجیریا

از ڈاکٹر محمد سجاد ۔ رانچی

اردو نثر کے فروغ میں دکن کا حصہ

اس موضوع پر اظہار خیال کے وقت پہلے اردو نثر کی وسعت اور دکن کی معنویت کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے، اردو کی مناسبت سے دکن کی تاریخ دراصل تین ادوار پر مشتمل ہے اولاً قدیم، جس میں عہد بہمنی، قطب شاہی عادل شاہی اور دور مغلیہ شامل ہیں یعنی [illegible]) دور وسطی میں سلطنت آصفیہ کے حیدرآباد [illegible]) کا شمار ہے، اور [illegible] تا ہنوز کو دور جدید سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، جس میں آندھرا پردیش نے کرناٹک دکن اور سلطنت حیدرآباد کی جگہ لے لی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ [illegible] سالہ نثری تاریخ کا مطالعہ کئے بغیر اردو نثر کے فروغ میں دکن کا حصہ جیسے موضوع کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔

ظاہر ہے کہ تھوڑے سے وقت یا محدود صفحات میں اتنی پوری تاریخ کا جائزہ ممکن نہیں، لہذا اس طویل دور عظیم تاریخ کے بعض قابل ذکر پہلوؤں اور عنوانات ہی کی نشاندہی ممکن رہ جاتی ہے، اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ لسانی اعتبار سے دکن کا علاقہ، دراوڑی زبانوں کا علاقہ ہے اور اردو کا ہند آریائی خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہے، اس وجہ سے شمال کے مقابلہ میں رقابت کے بجائے جنوبی ہند کے اس علاقہ میں اردو کے ساتھ ہمیشہ بڑی فراخدلی کا سلوک کیا گیا۔ اس خوشگوار روایت نے اردو زبان و ادب پر نہایت گہرے اثرات مرتب کئے، چنانچہ یہ سرزمین روز اول ہی سے اردو کا ایک ایسا گہوارہ بن گئی، جہاں مختلف لسانی خاندانوں نے ہم آہنگ ہو کر اسے ترو تازہ اور ہندوستان گیر بنا دیا۔ اردو کی تاریخ میں دو ادوار ایسے بھی رہے ہیں کہ اس وقت اگر اردو کا قافلہ سرزمین دکن میں خیمہ زن نہ ہوتا تو اس کے ایک چھوٹے گروپ کی طرح گھٹ کے رہ جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا، پہلا عہد تغلق اور اس کے بعد ... دہلی و لکھنؤ اسکول کی باضابطہ نثری تخلیق کی طرف ہے، ان دونوں ہو کھو

سرزمین دکن نے اردو کے اقتدار و طرز بیان کو وسعت عطا کی اور اس میں تبدیلی کروایا۔ اس طرح ماضی قریب کی تاریخ میں ترقی پسندیت اور جدیدیت کی انتہا پسندی کو اگر کہیں سے کچھ بڑا اعتدال نصیب ہوا تو وہ یہی سرزمین ہے۔

اردو نثر کے قدیم ترین نمونے بھی اسی زرخیز سرزمین میں ملتے ہیں۔ "معراج العاشقین" کو اگر پہلی نثری تصنیف دکنی تسلیم نہ کریں تو "کلمۃ الحقائق" کی اولیت کو بہرحال تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہیں گولکنڈہ قطب شاہ پہلا صاحب دیوان شاعر ہوا تو ملا وجہی کی "سب رس" نثر میں سب سے پہلی باضابطہ ادبی تصنیف بھی منظر عام پر آئی۔ اس کے آس پاس صوفیائے کے بے شمار رسالے اور داستان نویسوں کی داستانوں کا بھی ایک بیش بہا نثری خزانہ ہمیں یہیں دستیاب ہوتا ہے۔

بعد کے ادوار میں غالب، سرسید، شبلی، شرر اور سرشار سے لے کر عبدالحق، ڈاکٹر زور، یوسف حسین خاں اور عبدالقادر سروری تک کی جدید نثر کی نشوونما بھی میں اسی سرزمین کی حرکت، حرارت اور ہوا پانی کا اچھا خاصا دخل ہے۔ ان اصحاب قلم نثر نگار کے بہت سے کتابی کارناموں کی ترتیب و تخلیق اسی سرزمین میں ہوئی [illegible] دارالترجمہ [illegible] نظام اردو کی خدمت کسی اور طرح سے دوسرے اداروں اور انجمن ترقی اردو کی خدمت کی سیر وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں [illegible] دکن میں اردو نثر کی چند منزلیں نہایت [illegible] صحیح ہوتے ہیں۔ یہ تحقیقی نوعیت کے لکھی ہیں [illegible] کئے گئے لیکن اردو ادب کا کوئی قاری

یہ دیکھنا چاہیے کہ جہاں کثرت مجموعی حیثیت سے زیادہ کی تھی مضمون میں کام ہوا ہے کہ وہ زیادہ قابل ہے بجز مذکورہ تحقیقوں اردو ادب کی ایک اکیڈمی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

اگر قدیم دور کی شعری و نثری تخلیقات کا دور تھا تو عہد آصفیہ تحقیقی دور کا تحفہ ہے اور دکنیات پر کئے تحقیقات کے لئے ہمیشہ یادگار رہے گا، اور موجودہ دکن یعنی آندھرا پردیش کا جدید ترین دور پورے ملک میں طرز و مزاج کے اعتبار سے ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اردو بالکل ابتدائی دور میں دکن پہنچ گئی تھی۔ اسی وجہ سے صدیوں تک نثری ملفوظات، رسائل اور شعری تخلیقات کے تعارف و تمہید میں دکنی نثر ہی استعمال ہوتی رہی۔ حضرت خواجہ بندہ نواز، شاہ میراں جی، شاہ برہان اور شاہ امین، نیز ان بزرگوں کے خلفاء اور تلامذہ نے جو نثری تصانیف یادگار چھوڑے، ان سے اردو دنیا خوب واقف ہے۔ اس کے بعد قطب شاہی دور سے اردو نثر میں تمثیلی حکایتوں، طبع زاد اور ترجمہ شدہ داستانوں کا جو سلسلہ سب رس اور طوطی نامہ سے شروع ہوا وہ کام روپ و کام لتا، قصہ جنگ امیر حمزہ، نو طرز مرصع، قصہ مہر افروز و دلبر، ملکہ روم و شقیقہ اور قصہ [illegible] کے بعد تک جاری رہا۔ اس قدیم دور کی نثری تاریخ کی تفصیل دیکھنی ہو تو حکیم شمس اللہ قادری کی تصنیف "اردوئے قدیم"، ڈاکٹر زور کی "اردو شہ پارے" اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا جاری کردہ رسالہ "قدیم اردو"

کے علاوہ دکنی مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں دیکھنی چاہیئے جن میں ہزاروں تصنیفات کا مفصل تذکرہ و تعارف آگیا ہے۔ ان فہرستوں میں بالخصوص تذکرۂ مخطوطات مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ وغیرہ کی تصانیف و مضامین، نیز کتب خانہ آصفیہ کی فہرستیں، جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے کی فہرست مخطوطات بھی خاص ہیں۔

ترجمہ نگاری کے میدان میں حیدرآباد دکن ملک بھر میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ سرکاری سطح پر شہرۂ آفاق دارالترجمہ عثمانیہ نے آزادی کے قبل جملہ علوم و فنون کی وقیع ترین تصانیف کا جس تیزی سے ترجمہ کیا، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اردو میں فن ترجمہ نگاری اور اصطلاحات سازی وغیرہ کے اصول و مبادیات پر ماہرین نے وہاں جو کارنامے انجام دئے، آج بھی ان کی علمی و تحقیقی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جامعہ عثمانیہ میں پہلی بار سماجی علوم کے علاوہ سائنس اور فنی علوم تک کی تدریس اردو میں شروع ہو گئی تھی، اس وقت غیر منقسم ہندی ملک کی کسی دوسری زبان میں اردو نثر کی سی وسعت و ہمہ گیری کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی تھی۔ ترجمہ کے اس میدان میں سرکاری سطح کے علاوہ وہاں انفرادی کوششوں سے بھی گرانقدر خدمات انجام پائیں۔ اس سلسلے میں نواب فخر الدین خاں شمس الامراء کا دارالترجمہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

ترجمہ کی یہ روایت آندھرا پردیش میں ہنوز باقی ہے۔ چنانچہ تخلیق و تحقیق، تاریخ و تنقید اور مذہب و ثقافت کے شعبوں میں گذشتہ برسوں میں اہم ترجمے پیش کئے گئے ہیں۔

مثلاً "کمال اور زوال"[1] "دو شہروں کی کہانی"[2] "کہانی اور اس کا فن"[3] نیز "سمندر کی لیٹرس"[4] "شادی کی آخری شام اگرہ"[5] "استاد اور شاگرد"[6] کے علاوہ "تلنگو افسانے" اور "ملیالم افسانے"[7] بھی قابل ذکر ہیں جنھیں ساہتیہ اکیڈمی نے بالترتیب ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔ ان کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی اہم ترجمے ہوئے ہیں۔

اردو نثر کے باب میں سرزمین دکن کا تیسرا اہم میدان طنز و مزاح کا ہے۔ میر جعفر زٹلی[8] لدنوی[9] اور نگ زیب کے بیٹے کام بخش کے ساتھ دکن آئے تھے جنھوں نے ہزلیہ شاعری کے علاوہ طنزیہ نثری تصانیف[10]

---

[1] یونانی نژاد طوسی و یاسین کی "لا زوال تصنیف" تاریخ جنگ یونان قدیم" کا ترجمہ، شائع کردہ ساہتیہ اکیڈمی دلی ۱۹۶۶ء مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد، مترجم میر حسن مرحوم۔ [2] چارلس ڈکنس کے ناول "A tale of two cities" مترجم فضل الرحمٰن۔ [3] روسی ادیب استو توسنہ کے ایک طویل تنقیدی مضمون کا انگریزی کی وساطت سے مترجم مغنی تبسم، مطبوعہ شعور پبلیکیشنز حیدرآباد۔ [4] ابسن کا انگریزی ڈرامہ، مترجم فضل الرحمٰن۔ [5] ڈاکٹر ایس کے کمار صدر شعبہ انگریزی عثمانیہ کا ڈرامہ مترجم مغنی تبسم۔ [6] ملک بھر کے ماہرین تعلیمات کے مضامین کا ترجمہ، زیر اہتمام صیغۂ اردو نظامت ترجمہ حیدرآباد، ۵ ستمبر ۱۹۶۶ء، مطبوعہ شفیق پرنٹنگ پریس، حیدرآباد۔ [7] مترجم ڈاکٹر داسرتی۔ [8] مترجم جیلانی بانو۔ [9] ۱۰۲۸ھ تا ۱۱۲۵ھ۔ [10] مثلاً اخبار سیاہیہ، اخبار دربار معلی بحوالہ اردو نثر کا آغاز و ارتقاء ڈاکٹر رضیہ سلطانہ ص ۲۴۴۔

کا شہرہ زیادہ نہیں۔ دہلی کی مزاحیہ روایت سرشار، فرحت اللہ بیگ، قاضی عبدالغفار، رحیم میاں آوارہ و ناکارہ سے ہوتی ہے۔ زندہ دلان حیدرآباد تک پہنچ چکا ہے۔ یہاں کے مزاحیہ ادیبوں نے اپنی ذہانت طباعی سے مزاح کو نئی نئی طبعیاں عطا کی ہیں اور اپنے ماحول و معاشرے کے تضاد کو بڑے دلچسپ گریز پا انگیز طریقے سے ابھارا ہے۔ ان میں بھارت چند کھنّا، یوسف ناظم، شاہد صدیقی، رشید قریشی، عاتق شاہ، سرور ڈنڈا کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض فنکاروں نے عام بول چال کے مروجہ دکنی اردو سے بھی مزاحیہ رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی، جو ابتدا میں مقبول ہوئی، مگر جلد ہی بے احتیاطی کی وجہ سے بے اثر ہو گئی۔

حالیہ برسوں میں "زندہ دلان حیدرآباد" اور "شگوفہ" (رسالہ) کی کل ہند مزاحیہ کانفرنسوں، سمینار اور تنظیم نیز ڈیڑھ ماہی شگوفہ نے اس صنف کو ملک گیر مقبولیت اور وقعت بخشی ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں مجتبیٰ حسین کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے انشائیے خاکے اور مضامین ہیں۔ ان کے مزاح کی بے رحمی اور طنز و مزاح کی چاشنی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ یوسف ناظم نیز حیدرآبادی ہوتے ہوئے بھی قدیم فضا نفیس ہیں سے ہیں اس لیے انہیں حیدرآبادی کہے جا سکتے ہیں۔ جو بقول خود پہلے خالص ٹوپی والے کا مسلمہ تھے مگر اب بشارات ٹوپی پر اتر آئے ہیں ان کے مزاح کا کھلا کی انداز اور بیش قیمت خاکے اردو کے مزاحیہ ادب میں یادگار رہیں گے۔ اسی طرح رشید قریشی کی شوخی، ... ، ... کی طرح دار شائستگی، خواجہ عبدالغفور کا سلسلہ وار، انور اختر کا ڈرامائی، اور پروفیسر آشنا ... ، شیخ انجم، پرویز یداللہ مہدی نیز محمد ... احسن علی مرزا کی پھلجھڑیاں بھی یادگار بن چکی ہیں۔ ان کے علاوہ درجنوں فنکار اس صنف میں اچھی خاصی شہرت رکھتے ہیں۔

دکنیات تنقید اور طنز و مزاح کے خصوصی کارناموں کے علاوہ تنقید میں بھی حیدرآباد دکن کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ قابل فخر ہے کہ دکنی تنقید پر شبلی و عبدالحق، ڈاکٹر زور اور عبدالقادر سروری کا تحقیقی رنگ غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رضیہ سلطانہ، حنیفہ خلیق

۱ـہ تصانیف "سگرٹ اور آنسو"، "نصیحتیں"، "ٹھنڈی چھاؤں"، "مریم" ... ۲ـہ سنہ ۱۹۶۸ء ۔
۳ـہ سال اشاعت ... ۴ـہ تصانیف "تکلیف برطرف"، "دقت مختصر"، "قطع کلام" اور "بہر حال" ۔ ۵ـہ تصانیف "ساتھ ساتھ" اور ...

۱ـہ مجموعہ "مزاح شریف" ۲ـہ افسانوں کا مجموعہ "..." سنہ ۱۹۶۷ء ۔ ۳ـہ مجموعہ ... "مزاح پر کیا"
۴ـہ "تنقید زار"، "شگوفہ زار"، "لالہ زار"، "گل و گلزار" ۔ ۵ـہ مزاحیہ ڈرامے ... (۱۹۶۸ء) "پھول ہی پھول" (۱۹۶۸ء) "موج در موج" (۱۹۶۹ء) "غالب چچا" (۱۹۶۹ء) اور "ناراضگی کی خوشبو" (۱۹۷۲ء) ۶ـہ "ایک ادیبہ کی آپ بیتی"
۷ـہ "سائنس سے چلیے"، "در پردہ" ۸ـہ "چھیڑ چھاڑ"، "پگڈنڈی کے غلام" ۔ ۹ـہ "ہر چند" ۔

ب الدین صدیقی، غلام عمر خاں، زینت ساجدہ، حسینی شاہد، انجام خوند میری، مغنی تبسم، یوسف سرمست اور سلیمان اطہر جاوید وغیرہ کی تنقید میں ہم تنقید و تحقیق کی حسین آمیزش دیکھتے ہیں۔ اس سرزمین کی تنقید نگاری میں یوں تو تنقید کے تقریباً تمام ہی مکاتب فکر کے اثرات دکھائی دیتے ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ لسانی، سماجی اور تاریخی انداز نقد سب پر حاوی ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنے دوران قیام اپنی لسانی آگہی کو دکنیات کی طرف موڑ کر دکنی تحقیق و تنقید کو ایک نیا عنوان دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر وحید اختر اور مغنی تبسم کی تنقید پر جدیدیت کے اثرات نمایاں ہیں۔ جامعہ عثمانیہ، ونکٹیشور یونیورسٹی، انجمن ترقی اردو اور دوسرے اداروں نے جو تنقیدی و تحقیقی کارنامے پیش کیے ہیں، انھیں کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تخلیقی نثر میں ناول، ڈرامے اور افسانوں کا سرمایہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ عزیز احمد[1] اور ابراہیم جلیس[2] جیسے مشاہیر کے بعد اقبال متین[3]، جیلانی بانو[4]، اکرام جاوید[5] اور واجدہ تبسم[6]، عفت موہانی، عوض سعید وغیرہ نے ناول و افسانے میں جو کارنامے پیش کیے ہیں، انھیں اردو دنیا فراموش نہیں کر سکتی۔ ابراہیم شفیق، انور رشید اور مظہر الزماں نے بھی کئی کامیاب افسانے پیش کیے ہیں۔ ڈراما نگاری میں فضل الرحمٰن، مجیو فہیم، اظہر افسر اور رشید قریشی وغیرہ کے کامیاب ڈراموں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ ان ڈراموں میں مزاحیہ، سنجیدہ، ریڈیائی اور یک بابی غرض ہر طرح کے ڈرامے ہیں۔

ان کے علاوہ تاریخ، سوانح، تذکرے، ملفوظات، مذہبیات، فلسفہ، سیاسیات، سماجیات، تعلیم اور صحافت کے میدان میں بھی دور اول سے آج تک بیش قیمت مضامین و تصانیف کا ایک سلسلہ ملتا ہے۔ اس سرسری جائزے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حیدرآباد دکن نے اردو نثر کی چند صنفوں میں جو کارنامے پیش کیے ہیں، اس کی مثال کہیں اور مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ رانچی)

اعتذار

رسالہ کافی تاخیر سے آپ کی خدمت میں پہنچ رہا ہے جس کے بہت سے ناگزیر اسباب ہیں بہر حال ہمیں اس کا افسوس ہے ہم کوشش کریں گے کہ وقت پر آپ کو رسالہ مل سکے

---

[1] ہوس، مرمر اور خون، گریز، آگ، ایسی بلندی ایسی پستی۔ [2] چور بازار [3] ناول "چراغ تہہ داماں"، افسانوی مجموعہ "اجلی پرچھائیاں" (۱۹۶۱ء)، "کچا ہوا البم" (۱۹۷۱ء)، "خالی پٹاریوں کا مداری" (۱۹۷۷ء) [4] ناول "ایوان غزل"، افسانوں کا مجموعہ "روشنی کے مینار" (۱۹۵۸ء)، "نروان" (۱۹۷۱ء) [5] ناول "شیشے کی دیوار"، افسانوں کا مجموعہ "خواب ڈھونڈوں کہاں"۔

[1] ناول "کیسے کاٹوں رین اندھیری"

[2] افسانوں کا مجموعہ "سایہ کا سفر"، "تیسرا مجسمہ"، "تاج والا اجنبی"۔

(نواب محمد صابر قلی خان ادرگنی نواب صاحب محمد گڑھ)

روسی سامراج
کی
ہمسایہ ممالک پر یلغار

کمیونزم کے متعلق یہ خوش گمانی کہ یہ نظریہ یا تحریک غریب عوام محنت کشوں، مزدوروں یا کسانوں کی بہبود یا ان کے لئے راحت رسانی، یا ان کے اقتدار کا ذریعہ ہے، اب ایک افسانہ یا جھوٹی تسلی ثابت ہوچکی ہے۔ ابتدائی کمیونسٹ انقلاب کے باسٹھ سال گزر چکنے کے بعد، اسکی مختصر تاریخ پر گہری نظر ڈالیے تو وہ مکمل طور پر خون خرابہ سے بھری ہوئی ہے۔ اس ملحدانہ نظریہ و تحریک نے دنیا کو خون ریزی و غارت گری اور باہمی نفرت و عناد کے علاوہ کچھ نہیں دیا ہے، سرمایہ دارانہ سامراج جو یقیناً قابل نفرت ہے، انسانوں کا صرف مالی استحصال کرتا ہے، مگر کمیونسٹ سامراج مالی استحصال کے ساتھ ساتھ ذہنی وجذباتی استحصال بھی کرتا ہے اور جن اقوام کو اپنے شکنجے میں کس لیتا ہے، ان کی غیرت و حمیت عقیدہ و فکر، علم و عمل اور گفتار و کردار سب کو مکمل طور پر اپنی سخت ترین اور سفاکانہ گرفت میں لے کر اپنے اغراض و مقاصد کے لئے بے رحمی کے ساتھ استعمال کرتا ہے، وہاں اختلاف کی آزادی کی کوئی گنجائش ہی نہیں، بلکہ اس کی سب سے خفیف سزا موت ہے، دنیائے انسانیت کے لئے کمیونزم کا وبال یہودی ذہن کی دین ہے اور اس کے نظام میں اس گمراہ قوم کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ یہ نظام ظلم و زبردستی کے بغیر ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتا، اور منافقت و فریب کے بغیر

اور سامراجیت کے شدید ترین مخالف

ہونے کا دعویدار ہوتے ہوئے کمیونزم دنیا کا سب سے بدتر سامراج ثابت ہوچکا ہے، کمیونزم کے دو سب سے بڑے علمبردار روس اور چین جس بھیانک سامراجیت اور جس ڈھٹائی کے ساتھ توسیع پسندی کا نمونہ پیش کر رہے ہیں، ان کے سامنے گزشتہ تاریخ کے سارے سامراجی نظام اور نو آبادیاتی مظالم ماند پڑ گئے ہیں، حد یہ ہے کہ کمیونزم کے چھٹ بھیے ویت نام اور [illegible] نے بھی کمبوڈیا

اور اڈیریا میں جو مظالم اس بیسویں صدی کے رابع آخر میں وہاں کے غریب ترین عوام پر ڈھائے ہیں آج چنگیز و ہلاکو کی روحیں بھی جہنم میں شرمندہ ہوں گی۔ اور اب ۔۔۔ کمیونزم کی سب سے بڑی سامراجی طاقت اور سب سے بے شرم توسیع پسند و جارحانہ آمریت، روس نے اپنے کمزور اور غریب ہمسایہ ملک افغانستان پر جس دغابازی، سفاکی، عیاری اور بے شرمی کے ساتھ غاصبانہ فوجی قبضہ کیا ہے، اس نے پوری دنیا کو کرب و اذیت میں مبتلا کر دیا ہے۔

اس تہذیب و ترقی کے دور اور اشتراکی زبان میں "عوامی عہد" کا یہ عظیم ترین المیہ اور ستم ظریفانہ تضاد ہے کہ توسیع پسند روسی سامراج کی قاہرانہ فوجی قوت افغانستان جیسے چھوٹے، کمزور اور غریب ملک پر قبضہ و تسلط جمانے کے لئے استعمال کی جا رہی ہے، یہ کارروائی "باہمی فوجی تعاون" کے مکارانہ اور گھٹیا جھوٹ کے پردہ میں کی گئی ہے جو در حقیقت ایک ننگی بین الاقوامی ڈاکہ زنی اور کھلی جارحیت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، دنیا کی پوری انسانی آبادی کے سامنے اصل حقائق آئینہ کی طرح واضح ہو گئے ہیں اور اب روس کا بہروپیے اپنے مکروہ و سفاک سامراجی چہرہ کو اپنے تنخواہ دار، غدار و ملت فروش افغانی پٹھوؤں کی آڑ میں چھپانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ظالم روسی سامراج نے اپنے بھیانک زہریلے پنجے برصغیر کے بہت قریب تک پھیلا دئے ہیں، اور پوری دنیا جانتی ہے کہ وہ کس چالاکی، عیاری اور سفاکی سے دوسری قوموں کو اپنی بے رحم گرفت میں لے لیتے ہیں، کمیونزم کا یہ فریب نظریہ اور اس کی سرطانی تحریک ان کی توسیع پسندی اور سامراجی عزائم کا مخفی ذریعہ اور آلۂ کار ہیں اور وہ اپنے سامراجی مقاصد کو حاصل کرنے کے سلسلہ میں اپنے چنگل میں پھنسے ہوئے ملکوں کے لاکھوں غریب ترین عوام کو خون کا غسل دیتے رہنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ افغانستان میں جو لاکھوں انسان ابھی تک قتل و ہلاک کئے جا چکے ہیں اور وہ لاکھوں عوام جو اپنے ملک و قوم کی آزادی اور دین و ایمان اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے جانوں کی بازیاں لگا رہے ہیں، اور وہ لاکھوں لوگ جو اپنے وطن سے باہر دھکیل دئے گئے ہیں اور پڑوسی ملکوں میں غربت و افلاس کی زندگیاں گذار رہے ہیں غریب عوام نہیں تو اور کون ہیں، افغانستان دنیا کے غریب ترین ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے، وہاں خوشحال لوگ مٹھی بھر سے زیادہ نہیں ہیں، بلکہ موجودہ غدار و قوم فروش ٹولہ جسے روسی سامراج خرید سکا ہوا ہے اور وہ تو خوشحال طبقہ سے ہی تعلق رکھتا ہے، پھر کیا کوئی بھی ہوشمند انسان اس ننگی جارحیت اور سفاکانہ قتل عام اور نسل کشی کو کسانوں اور مزدوروں کا عوامی انقلاب کہہ سکتا ہے

افغانستان سے ہندوستان کے صدیوں پرانے روابط ہیں، لیکن گذشتہ دو صدیوں کے دوران برطانوی اقتدار سے آزادی کی جدوجہد کے سلسلہ میں دونوں ملکوں اور قوموں کے درمیان جس قدر ہمدردانہ، برادرانہ اور گرمجوشی کے تعلقات استوار ہوئے ہیں، انھوں نے اہل ہند کو اہل افغانستان کے ساتھ جذباتی طور پر متحد و منسلک کر دیا ہے، اس کے علاوہ ہندوستان کے بارہ کروڑ

مسلمان اہل افغانستان سے دین و ایمان کے رشتہ سے جڑے ہوئے ہیں، ایک ہی امت کے اجزاء اور آپس میں بھائی بھائی ہیں، علاوہ بریں آل ہندوستان کے کروڑوں پٹھان نسل کے باشندوں کا اپنے افغانی بھائیوں سے نسلی رشتہ بھی ہے اور افغانستان میں روسی درندے جو خون بہا رہے ہیں، وہ ہمارا ہی خون ہے جو ہماری رگوں میں بھی دوڑ رہا ہے اور جن عوام کو روسی کمیونزم کا دیو اسیر اور وہاں شہید کر رہا ہے، وہ سب ہمارے دینی اور نسلی بھائی اور عزیز و اقارب ہیں، روسی سفاکوں کے ان وحشیانہ مظالم پر ہم بھی شدید کرب و اذیت محسوس کر رہے ہیں، جیسے جسم کے ایک حصہ پر زخم لگنے سے دوسرے حصوں کو محسوس ہوتی ہے، ہمارا وطن اور پوری ہندوستانی قوم اس وقت اپنے پڑوسی ملک اور دوست و برادر قوم افغانستان اور افغانیوں کے ساتھ ان کی اس دردناک مصیبت میں بھرپور ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کی جرأتمندانہ و جاں فروشانہ جدوجہد آزادی کی حمایت و تائید کرتے ہیں، ہندوستانی عوام کی غالب اکثریت کا مطالبہ ہے کہ روسی سامراج بلا تاخیر اپنی فوجوں، ماہروں، مشیروں اور ہتھیاروں کو افغانستان سے واپس نکال لے، اور اس غیور و حریت پسند قوم کو اپنا مستقبل متعین کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دے، تاکہ افغان قوم اپنی اجتماعی پسند کا نظام اور آئین مرتب کرے، اور پوری آزادی و خود مختاری کے ساتھ اپنا حکومت کا انتخاب خود کرے۔ افغان قوم سے ہمارے دیرینہ خوشگوار تعلقات اور دنیا کے اس خطہ میں ہمارے ملک کی دفاعی اور اہم پوزیشن نیز موجودہ بین الاقوامی

حالات کا سخت ترین تقاضا ہے کہ ہماری حکومت اپنے ہمسایہ ملک افغانستان کو روس کے جارحانہ فوجی تسلط سے آزاد کروانے میں پوری جدوجہد اور ہر ممکن طریقہ اختیار کرے، اقوام متحدہ، عالمی طاقتوں اور ایشیائی ممالک کا بھی یہ انسانی اور بین الاقوامی فرض ہے کہ اس کمزور اور غریب ملک کی ایک جابر طاقت سے گلو خلاصی کرانے میں حق انسانیت ادا کریں اور قبل اس کے کہ یہ چھوٹا سا ملک تباہی اور موت کی مہیب خاموشی میں ڈوب جائے اس کو روسی سامراج کے خونخوار شکنجے سے ہر ممکن عمل طریق اختیار کر کے چھڑا لیا جائے۔ کمیونزم کے عروج اور روس کی توسیع پسندی روایات اور ان دونوں کے امتزاج کو مدنظر رکھ کر روس کی ہمسایہ تمام ایشیائی اقوام و ممالک کو روسی سامراج کی توسیع پسندی کا سامنا کرنے کے لئے لازم ہے کہ اپنے اندرونی و بیرونی دفاعات کو چست اور مضبوط کر لیں اور اس عظیم خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے باہمی اتحاد عمل اور اتحاد سے کام لیں، کیونکہ اس طرح توسیع پسند طاقت کو اس کی ہر کامیابی اگلے جارحانہ اقدام کے لئے آمادہ اور دلیر کرتی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ روسی سامراج سالہا سال سے اپنے پڑوسی ملکوں اور قوموں کو اپنے سلطنتی حدود میں شامل اور اپنی ذیلی و طفیلی قومیتوں میں منسلک کرتا چلا آ رہا ہے اور اب افغانستان پر قبضہ ۔۔۔ اس کی توسیع کی تیسری لہر شروع ہو گئی ہے، آج اس کی زد میں ایشیا اور افریقہ کے تمام ملک آتے ہیں اور روس کی جارحیت کی اصلی منزل تک کامیابی کے ساتھ بڑھ گئے تو مسلم ممالک اب یہ لازم ہے کہ متحدہ فوجی دفاع کا نظم قائم

کرنے کے ساتھ ساتھ نظریاتی میدان میں بھرپور منظم علمی اور اقدامی کارروائی کریں، تاکہ نہ صرف اسلامی ممالک کی نئی نسل کمیونزم کے پرفریب پروپیگنڈے کے جال میں پھنسنے سے محفوظ ہو جائے، بلکہ خود روس کے جکڑے ہوئے عوام تک بھی ایک بہتر و برتر نظریہ و نظام کا پیغام اور حریت فکر و عمل کی تحریک پہنچ جائے۔ روس کے تمام ہمسایہ ممالک کے لئے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں روس کے تنخواہ یاب ایجنٹ کمیونسٹ کارکنوں کی حیثیت میں پہلے سے علانیہ یا پوشیدہ مصروف عمل ہیں، جن کے ذریعہ روسی سامراج ہر ملک میں تباہی، ابتری اور گرانی کی تکمیل کے بڑی تعداد میں قوم فروش خریدنے کی پوزیشن میں ہے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اپنی ننگی جارحیت کے جواز میں جو قانونی نکات اور دلائل وہ آج ڈھٹائی اور بے شرمی سے پیش کر رہا ہے، آئندہ دیگر مواقع پر بھی انہیں انہی ڈھٹائی اور بے شرمی سے دہرا سکتا ہے۔

بقیہ "مُلّا کی اذان اور" ص ۲۵ سے آگے۔

شیخ بن جائیں، نام کے مسلمان کام کے مسلمان بن جائیں، اگر دیکھئے تو محض جماعت اسلامی ایک دینی جماعت ہے جو دین کو سربلند کرنے میں کی خدمات اور قربانیوں کا اعتراف اس کی اپنی زبان سے نہیں بلکہ تاریخ کی زبان سے ملے گا۔ مولانا مودودیؒ کا یادگار کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ملک کو مسلمان بنایا اور اسلامی نظام حیات کی تفصیل کر کے آگاہ کر کے دلوں میں ان کی عظمت کو حقیقت کے تسلیم کروا کر روشن و مستحکم کر دیا۔ اگر آپ کے ذہن میں شبہ ہو تو پھر جو تعلیم ہو کہ اس قیمتی کارنامے کس طرح وہ عالم آگاہیں اور اپنی اس حرکت پر نازاں ہے۔

نواب محمد صابر علی خان صابر
(نواب صاحب محمد گڑھ)

غزل

اندھیرا خود گریزاں ہو گیا ہے
طلوعِ مہر تاباں ہو رہا ہے

پتنگا رات بھر لو سے لڑا ہے
بجھا کر شمع خود بھی سو گیا ہے

چلی ہے پھر چلی ہے سرخ آندھی
اماں کا باغ ویراں ہو رہا ہے

ہمارا ہی ترا شیدا ہے ہر بت
خدائی کا جو دعویٰ کر رہا ہے

کفن سر سے لپیٹے جا رہے ہیں
یہی دنیا میں جینے کی ادا ہے

لہو سے سینچ ڈالیں کشت اپنا
غضب کا اب کے سوکھا پڑ گیا ہے

نہیں ہو تم ہی اک دیوانے صابر
بہت ہی عام اب تو یہ وبا ہے

ایڈیٹر ایشیا لاہور

"ملّا کی اذان اور مجاہد کی اذان اور"

"الفرقان" کے قارئین حضرات کی توجہ درکار ہے

دیکھتے ہیں دو پرندے ایک ہی فضا میں پرواز کرتے ہیں، لیکن ان کی منزلیں جداگانہ ہوتی ہیں - بقول اقبال

ـــ شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور

عالم اور مجاہد ایک ہی دین کے لئے کام کرتے ہیں، لیکن ان کے میدان اور راستے قطعی جداگانہ ہوتے ہیں ایک چیز عالم کے نزدیک بعض اوقات درست ہوتی ہے، لیکن وہی چیز مجاہد کے لئے خلاف مصلحت ہوتی ہے اور ایسا بھی ہوا ہے کہ بسا اوقات عالم نے ایک کام کو ناروا قرار دیا، لیکن مجاہد کو اپنے مقصد کے لئے وہ ایک دینی معاون معلوم ہوا، اس لئے کہ عملی میدان کے تقاضے کتابی علوم سے مختلف ہوتے ہیں، فتح مکہ کے لئے جب اسلامی لشکر روانہ ہوا تو وہ رمضان کا زمانہ تھا، موسم کی شدت اور راستے کی دشواری اور [illegible] دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

رخصت عطا فرما دی کہ روزہ افطار کر لیا جائے، اس لئے کہ اہم جہاد میں [illegible] کی گئی تھی، وہ فریضہ صوم سے بھی بڑھ کر تھا۔ بعض نے روزہ افطار کر لیا اور بعض نے مزید حصول ثواب کی خاطر افطار نہ کیا۔ جن لوگوں نے روزہ افطار کر لیا، وہ لشکر کے امور میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے، لیکن جو روزے سے تھے وہ نڈھال ہو کر پڑے رہے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آج روزہ افطار کرنے والے روزہ رکھنے والوں پر سبقت لے گئے۔

جہاد کتابی نہیں عملی معاملہ ہے، اس کے اندر جو پیچ و خم آتے ہیں، مکتب میں بیٹھا شخص اس کا اندازہ نہیں کر سکتا ہے، نہ تصور، یہی وجہ ہے دین کے معاملے کو تمام امور پر فوقیت دی گئی ہے، اور جہاد کو صوم نیز ملتوی کر کے [illegible] صوم و صلوٰۃ میں ترجیح کر دی گئی ہے، عملی میدان

ہ مشکلات کتابی اصولوں کی طرح خطِ مستقیم میں نہیں آتیں اصولوں کے انطباق میں لچک کا مرحلہ ان میں آئے بغیر نہیں رہتا، مثلاً مجاہد کا کام مقصد کے لئے اپنی جان تک لڑا دینا ہے، لیکن عظیم تر مقصد کا یہ تقاضا بھی ہے کہ جان ضائع نہ جانے پائے، اپنی طاقت بچانے کے لئے اگر کہیں پسپائی ضروری ہے تو وہ بھی کر لی جائے۔

عملی میدان کی مشکلات سچی بات ہے کہ صرف مردانِ میدان ہی جان سکتے ہیں، میدانِ عمل سے دور در مکتب کی پرسکون زندگی میں بیٹھنے والے اہلِ علم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لڑائی میں پانچ خندقوں سے نیچے بھی اتر آتا ہے، لیکن اگر کسی صاحب کی نگاہ میں یہ بات پہنچی ہو کہ تلوار زن مجاہد کا پانچ خندقوں سے کسی صورت میں بھی نیچے نہیں ہونا چاہئے تو اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ راہ و رسمِ منزل سے واقف نہیں ہے۔

عملی میدان کے مسائل کا صحیح ادراک صرف عملی کام کرنے والوں ہی کو ہوتا ہے، جو اس میدان کے آدمی نہیں ان کے لئے ان مسائل کو تخیل سے بھی سمجھنا مشکل ہوتا ہے، حقائق کی دنیا میں الجھنوں کو سلجھانے کے لئے جو تیشے اہلِ میدان کو کرنے پڑتے ہیں، وہ بس وہی جانتے ہیں۔ سپریم کورٹ پاکستان کے چیف جسٹس منیر صاحب نے اسی طرح ایک نہایت اہم اور نازک کیس (ڈوسو کیس) میں جو فیصلہ دیا تھا، اس کے بارے میں انہوں نے پانچ برس بعد ایک تقریر میں بتایا:۔

"ان مسائل پر فیصلہ دیتے ہوئے ججوں کو جس ذہنی کرب سے گذرنا پڑتا ہے، وہ بس وہی جانتے ہیں ۔۔۔ ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ملک انتشار کی نذر ہونے سے کیونکر بچے ۔۔۔ جب ایسے لمحات آتے ہیں تو ان میں فیصلے قانون کی کتابوں سے نہیں بلکہ رونما ہونے والے واقعات و حالات کے اندر سے ہو کئے جاتے ہیں۔"

مولانا مودودیؒ صرف ایک عالمِ دین ہی نہ تھے بلکہ مجاہدِ دین بھی تھے، اقامتِ دین کی جدوجہد میں ان کو حقائق کی دنیا میں جو بعض تلخ فیصلے کرنے پڑے، اگر ان کو خالص فقہی نگاہ سے دیکھا جائے تو یا یوں ہی باعثِ تعجب نہیں، لیکن جب حالات کے اس پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو مولانا مودودیؒ کی عظمت اور بھی نمایاں ہوتی ہے، صرف عملی میدان کا تجربہ رکھنے والا ہی جان سکتا ہے کہ دو تقاضوں کے درمیان ایک صاحبِ عمل کو اپنا راستہ کیسے بنانا پڑتا ہے، مکتب کی چہار دیواری میں مختلف حضرات ان مسائل کی نوعیت اور نزاکت سے کبھی واقف نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر ایوب خان کے مقابلے میں محترمہ مس فاطمہ جناح کی تائید کا معاملہ ہے، جن لوگوں کی نگاہ صرف مولانا مودودیؒ کی خامیوں کی تلاش میں ہو یا الفاظِ حدیث کے عقب میں روحِ حدیث کو نہ دیکھ سکتی ہو، وہ نہیں جان سکتے کہ وہ کون سے پیچیدہ اور مشکل حالات تھے جن میں ایوب خان کے مقابلے میں محترمہ مس فاطمہ جناح کی تائید کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

ابھی پچھلے دنوں مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کی ایک کتاب بعنوان "معاصرین" دیکھنے کا اتفاق ہوا، جا بجا نہ ماضی کی اس میں عجیب و غریب مثال تھی۔

مولانا مودودی کے بارے میں لکھتے ہیں :-

دو باتیں ان کی کسی طرح بھلائے نہیں بھولتیں ایک تو جب صدر پاکستان کے الیکشن کا مسئلہ چھڑا اور ایوب خان سے خفا ہوئے تو قرار دیا کہ ایک طرف ان میں کوئی خوبی نہیں سوائے اس کے کہ وہ مرد ہیں اور دوسری طرف ان کے مقابل میں فاطمہ جناح ہیں جن میں کوئی برائی نہیں سوائے اس کے کہ وہ عورت ہیں ۔۔ زبان کی اس درجہ بے احتیاطی بجائے خود ایک قہر الٰہی ہے اور اللہ اپنے اس قہر سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے ۔

یہ جملہ خود طلب ہے "ایوب خان سے خفا ہوئے" ۔ گویا اس کی مخالفت ذاتی رنجش کا معاملہ تھا ۔

مولانا دریا بادی پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے ، جب کسی کی تعریف کرتے تھے تب بھی کسی مقام پر نہیں رکتے تھے اور جب کسی کے خلاف ہوتے تھے ، تب بھی ان کے لیے کوئی قید نہیں ہوتی تھی ۔ ان کے مرشد مولانا اشرف علی تھانوی مرزا غلام احمد قادیانی کے ہر نوع کے ماننے والوں کو کافر سمجھتے تھے ، لیکن مولانا دریا بادی عمر بھر غلام احمد قادیانی کی تفسیرات کی تاویل کرتے رہے ۔ ایوب خان کے سلسلے میں مولانا مودودی کے موقف پر نکتہ چینی کرتے ہوئے انھوں نے ذرا بھی زحمت گوارا نہ کی کہ پاکستان کے وہ حالات معلوم کر لیتے جن میں مولانا مودودی کو ایسا تلخ فیصلہ کرنا پڑا تھا ۔ مولانا مودودی کے خلاف جذبات سے قطع نظر سیاق سے جب بھی کوئی بات کاٹی جائے گی ، تو اس کا حقیقی مفہوم اوجھل ہو کر رہ جائے گا ۔

اور کچھ اسی قسم کا منظر مولانا منظور صاحب نعمانی کے الفرقان لکھنؤ کے جنوری سنہ کے شمارے میں دیکھنے میں آیا ۔ مولانا مودودی سے اپنی رفاقت کی سرگزشت کے پہلے حصہ میں انھوں نے ان واقعات سے پردہ اٹھایا تھا جن کی وجہ سے وہ جماعت اسلامی میں شامل ہونے کے بعد اس سے انقطاع پر مجبور ہوئے تھے ، دوسرے حصے میں ان وجوہ و اسباب کا بیان ہے جن سے مولانا نعمانی کا مولانا مودودی سے ذہنی بُعد ہوا ۔ جنوری سنہ کے شمارے میں نعمانی صاحب نے مولانا مودودی کی تضاد بیانی واضح کرنے کی کوشش کی ہے ، یہ کہ ایک زمانہ تھا کہ انھوں نے کانگریس اور لیگ کے حامیوں پر اس لیے تنقید کی تھی کہ وہ اسلام کی منزل کو غیر اسلامی طریقوں سے حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن پاکستان بننے کے بعد مولانا مودودی نے وہ سب کچھ خود کیا جس پر پاکستان بننے سے پہلے گرفت کرتے تھے ۔

مولانا نعمانی کی یہ تحریر حقائق سے آنکھیں چرانے کا شاہکار ہے ۔ ان کی نگاہ مولانا مودودی کی کمزوریوں کی تلاش میں تو بھٹکتی ہی ، لیکن اس پس منظر کی جانب نہ اٹھ سکی جس میں مولانا مودودی قیام پاکستان سے آخر عمر تک جدوجہد کرتے رہے تھے ۔ مولانا بھارت میں رہتے ہیں ان کو پاکستان کے حالات سے کما حقہ واقفیت نہیں ہے لیکن کیا وہ پاکستان کے حالات سے اتنے بے خبر ہیں کہ یہ بھی معلوم نہ ہو کہ پاکستان کے اندر دینی اور لادینی قوتوں کی کشمکش کا آغاز کیسے ہوا ، اور یہ بڑھ کر پیکار کیسے بنی ؟ جس طرح

احکام دین کی حکمت، شانِ نزول کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی
اسی طرح کسی بھی کشمکش کی حقیقت اس کا پس منظر سمجھے
بغیر واضح نہیں ہوتی۔

عملی کشمکش میں آدمی کو فیصلے کتابی اقتباسات سے
نہیں بلکہ حالات کے مطابق کرنے پڑتے ہیں۔ ہرے بھرے
پھلدار درخت کا کاٹنا صریح ظلم ہے، لیکن بنی نضیر کی یہودی
بستی کے محاصرے میں مسلمانوں کو عسکری ضرورت کے لئے
یہ درخت بھی کاٹنے پڑے، اس پر یہودیوں نے پروپیگنڈا
کا طوفان اٹھایا کہ مسلمان پھلدار درختوں پر بھی رحم نہیں
کرتے، سیاق سے ناواقف مستشرق آج بھی یہ لکھتا
ہے کہ پھلدار درختوں کا کاٹنا نامناسب عمل تھا، لیکن
کیا سیاق سے واقف بھی ایسا کہہ سکتا ہے؟ اچھے سے اچھا
فیصلہ بھی جب سیاق سے کاٹ دیا جائے گا تو وہ غلط
اور نامناسب معلوم ہوگا، افسوس کہ نگاہ کا یہی مرض ہے
کہ جو بعض لوگوں کو مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی
کی کامیابی سے تنگ شمار کرنے کے علمی بحث پر لگائے ہوئے
ہے، جو لوگ حالات کے عینی شاہد رہے ہیں، وہ
ایسی تنقید کو نہ صرف غلط، بے بنیاد اور بے جا کہنے پر
مجبور ہیں، بلکہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ حقیقت
میں یہ مولانا مودودی کے خلاف بغض ہے جس نے یہ پردہ دور
کھینچ رکھا ہے۔

نعمانی صاحب نے اپنی سرگزشت کی تازہ قسط میں
جو نکات اٹھائے ہیں، ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

● مولانا مودودی مسلمانوں کی قومی سیاست پر تنقید
کرتے تھے، لیکن پاکستان بننے کے بعد وہ اسی سیاست
کا خود شکار ہوگئے۔

● پاکستان کے پہلے انتخابات میں حصہ لیا، لیکن بری
طرح ناکام رہے۔

● دوسرے الیکشن میں انتخابی سمجھوتہ کیا، اور جو
سخت رویہ پہلے الیکشن کے موقع پر اختیار کیا تھا، اور
اس کو شرعاً ضروری کہا تھا، اس کو بدلنے کا فیصلہ کیا۔

● الیکشن کے ذریعہ حکومتی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش
کے سلسلے میں بھی بعض فیصلے اور اقدامات ایسے کئے ہیں
جو شریعت کے اصول و احکام اور خود مولانا مودودی اور
جماعت اسلامی کے قدیم نظریات کے قطعی خلاف تھے۔
نعمانی صاحب کے الفاظ میں "حکومتی اقتدار حاصل کرنے
کے لئے"

● جماعت کا مزاج دین کی حامل دعوتی جماعت
کی بجائے سیاسی پارٹی والا بنتا چلا گیا۔

● اپنی اس تبدیلی کو مولانا مودودیؒ نے حکمت عملی
قرار دیا، اور اسلام اور اسلامی حکومت کا نام لے کر
اپنی سیاسی جدوجہد کے لئے ہر حرام کو حلال کر لیا۔
ایک وقت تھا کہ مولانا مودودیؒ عورت کے لئے مجلس
قانون ساز کی رکنیت بھی درست نہیں سمجھتے تھے، لیکن
وہ وقت آگیا کہ ایوب خاں کے مقابلے میں مس فاطمہ
جناح کی تائید کی اور اس کے لئے عملاً میدان میں اتر آئے۔
عیب جوئی کی ساری تان اس پر توڑی گئی کہ مولانا مودودیؒ
نے احکام دین کو محض سیاسی مقاصد کا آلۂ کار بنا دیا۔
نعمانی صاحب کے نزدیک جس تجربے فتنے کا دروازہ
مولانا مودودیؒ نے کھولا ہے، وہ یہی ہے، اس کے

الفاظ میں، مولانا مودودیؒ کا یہ نظریہ وقت کے کسی بھی جابر اور تجاوز کرنے والے کے لئے ظلم کی سند اور دستاویز بن سکتا ہے ۔

مولانا نعمانی صاحب کے نزدیک مولانا مودودیؒ کی قیام پاکستان کے بعد کی پوری پالیسی سیاسی تھی اور اس میں دین کو ہمیشہ کے لئے آلۂ کار بنا لیا گیا ۔ نعمانی صاحب کے تجزیے کے مطابق قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی ایک داعی اقامت دین جماعت نہیں بلکہ ایک سیاسی ٹولہ بن کر رہ گئی جس کا مقصد صرف حصول اقتدار تھا ۔ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کو اقتدار کا بھوکا کہنے والے صرف نعمانی صاحب ہی نہیں، سوشلسٹ، لادین اور قادیانی بھی ہیں ۔ اگر اسلام کے اقتدار کے لئے جماعت اسلامی کی جنگ دین دشمن عناصر کو ناگوار تھی تو یہ درد دین رکھنے والے لوگوں کو بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی ۔ اقبالؒ نے شاید کسی ایسے موقع کے لئے کہا تھا ۔

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لئے
کہ یک زباں ہیں فقیہان شہر میرے خلاف

یعنی اپنے لئے سیاسی کام کرو تو ٹھیک ہے اور کفر سے لیکن دین کا نام لو تو جھوٹے اور منافق ۔ اگر معاملہ یہ ہے تو پھر دین کا کام کون کرے گا؟ سوال یہ ہے کہ اگر دین اور سیاست ایک ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ سیاسی امور میں دین کا نام نہ لیا جائے ۔ اور افسوس تو ان پر ہے جو دین و سیاست کو یکجا سمجھتے ہوئے، سیاست میں دین کا کام کرنے والوں پر طعن توڑتے ہیں ۔ گویا وہ سیاست کا میدان علمبرداران جاہلیت کے لئے تو روا سمجھتے ہیں، لیکن یہ پسند نہیں کرتے کہ اہل دین بھی اس میں قدم رکھیں ۔

نعمانی صاحب انڈیا کے باشندے ہیں، وہ یہ نہیں جانتے کہ اسلام کے نام پر وجود میں آنے والے پاکستان کے اندر اسلام کو کتنے طوفانوں کا سامنا کرنا پڑا ہے ۔ افسوس تو یہ ہے کہ کھلی لادینی قوتوں یا سیاست کے لئے کام کرنے والے علماء کو تو اہل علم دین نے کبھی ایسا طعن نہ دیا تھا، لیکن جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے بارے میں ایسا زہریلا طعن کیوں منتخب کیا گیا ہے ۔

ہم نعمانی صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مولانا مودودیؒ نے تشکیل پاکستان سے پہلے بھی نفاذ اسلام ہی کے لئے اپنی جان لڑائی تھی، اور بعد میں بھی ان کی جدوجہد کا تمام تر محور صرف اسلام ہی رہا ۔ ساری تبدیلی اسٹریٹیجی کی تھی، مقصد کی نہ تھی ۔ پاکستان میں آ کر دیکھئے کہ اسلام کا راستہ جب روکنا مقصود ہوتا ہے تو کال کس کو دی جاتی ہے ۔

مولانا مودودیؒ کی قیام پاکستان کے بعد کی سیاست کی سمجھ اس وقت تک نہیں آ سکتی جب تک پاکستان کی آئینی تاریخ سامنے نہ ہو ۔ قیام پاکستان سے قرارداد مقاصد کی منظوری تک ریاست اسلامی اسی مرحلے میں رہی جس میں جماعت اسلامی ابتداء اس وقت تھی ۔ اس کے نزدیک سرکاری ملازمتوں اور مقننہ میں شمولیت اس وقت تک جائز نہیں ہو سکتی جب تک مملکت پاکستان نے اپنی زبان سے اللہ کی حاکمیت کا اقرار کر کے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہ کر دیا ۔ جماعت اسلامی کے صحیح موقف سے عدم واقفیت

جماعت اسلامی کا قیام پاکستان کا ابتدائی دور بڑا ہی پرآشوب

اور تکلیف دہ گزرا تھا، اس پر بغاوت تک کے مقدمات بنائے گئے، اور اس کو ملک کے لئے خطرہ نمبر ایک قرار دیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلے نظر بند کئے جانے والے کمیونسٹ نہ تھے، بلکہ پاکستان میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کرنے والے مولانا مودودیؒ اور ان کے ساتھی تھے۔

قرارداد مقاصد کے بعد جماعت اسلامی کے لئے پاکستان محض ایک ملک یا قومی ریاست نہیں رہا، بلکہ ایک ایسی مملکت بن گیا تھا جس نے دستوری زبان میں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر کے اس عزم کو بھی اپنا لیا تھا کہ وہ اپنے باشندوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کتاب و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اپنی تمام حکومتی وسائل بروئے کار لائے گی۔ اس اعلان کے بعد کم از کم جماعت اسلامی کیلئے پاکستان بمنزلہ مسجد کے ہو گیا تھا، اور جماعت اسلامی نے فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان کی تعمیر و ترقی میں پورا پورا تعاون کرے گی اور اس کو اسلام کی منزل سے ہمکنار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑے گی۔

اور ان کا فقہ کی کتابوں میں کہیں گھڑا گھڑایا نسخہ نہیں ہے کہ کسی ملک کو اسلام کے رخ پر موڑنے کے لئے کیا کیا جائے؟ ہر زمانے کے اہل دین کو حالات کی روشنی میں اپنا راستہ خود ہی بنانا پڑا۔ پاکستان کی دستور میں وہ عنصر پیکر طاقت ور نہیں تھا جو سیکولرزم پر یقین رکھتا تھا، اور دل سے چاہتا تھا کہ پاکستان ایک سیکولر قومی ریاست بن جائے۔ پاکستان میں اور بھی بڑے بڑے عالم اور درد دین رکھنے والے موجود تھے، لیکن کیا کسی کی نگاہ دور رس نے یہ چیز دیکھی تھی کہ ملک کی منزل اسلام کے رخ میں پھیرنے کا صحیح وقت

وہ ہے جب دستور یہ کام کر رہا ہو؟ مولانا مودودی نے قیام پاکستان کے معاً بعد جیسے تھیوکریسی اور اسلامی حکومت کے فرق کو واضح کیا، تاکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا ذہن اسلامی حکومت کے بارے میں صاف ہو، پھر ملک کی رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے اسلامی نظام زندگی کا تفصیلی نقشہ پیش کیا اور قوم کو یاد دلایا کہ اس کے ذمے ایک تاریخی وعدہ بھی ہے، جب اس نے کہا تھا کہ اگر اسے ایک الگ خطۂ زمین مل گیا تو وہ وہاں پر اللہ کے دین کے مطابق زندگی بسر کرے گی، مولانا مودودی کی تنہا اور واحد آواز تھی جس نے حکومت کے ایوانوں میں تہلکہ مچا دیا تھا، اہل اقتدار کا سیکولر خواب پریشان ہو کر رہ گیا لیکن جب تک وہ مولانا مودودیؒ کی آواز کو دبانے کیلئے تیار ہوئے اس وقت تک قوم بیدار ہو چکی تھی، اس کی سزا مولانا مودودی کو یہ دی گئی کہ پہلے نظر بند کیا گیا، پھر سزائے موت سنائی گئی۔

مولانا مودودی کی یہ خدمت، اگر دینی نہیں بلکہ قومی سیاست کا حصہ اور حصول اقتدار کی جدوجہد بھی تو لوٹے کرم تیا جائے کہ پھر اسلام کی خدمت کی اور کیا شکل ہو سکتی تھی۔

کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

قرارداد مقاصد کے بعد تحریک اقامت دین کے لئے ملک کی تعمیر و ترقی میں شمولیت کا موقع ہم آ پہنچ گیا تھا، اب ضرورت تھی کہ ملک کو وہ قیادت فراہم ہوتی جو ملک کے نظام کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکتی اور جمہوری نظام میں اس کا ایک ہی راستہ ہوتا ہے، اور وہ انتخابات ہوتے ہیں، جماعت اسلامی جانتی تھی کہ قوم دین

سے ناکامی اگرچہ انتخابات کے راستے کامیابی ایک
خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، لیکن جماعت اسلامی
نے بالمقصد فیصلہ کیا کہ وہ انتخابات میں حصہ لے گی اور
انتخابی مہم کو دعوت دین کے لیے استعمال کرے گی اور
عوام کے سامنے نمونہ پیش کرے گی کہ پاکستان کو اسلام
کی منزل سے ہمکنار کرنے والے خادم کیسے ہونے چاہیئں
چاہے انہیں ایک بھی ووٹ نہ ملے، چنانچہ جماعت اسلامی
نے عہد قریب کی تاریخ میں عملاً دکھا دیا کہ جھوٹ کی
دنیا میں سچائی کا دامن چھوڑے بغیر کیسے حصہ لیا جاتا ہے۔
مولانا اصلاحی فرماتے ہیں کہ جماعت اسلامی نے الیکشن
میں حصہ لیا اور ناکام رہی لیکن جن لوگوں نے جماعت
اسلامی کی جدوجہد کو بچشم خود دیکھا ہے وہ شاہد ہیں کہ
یہ ناکامی نہیں بلکہ پاکستان میں دینی کامیابی کی ابتدا تھی۔
عامۃ الناس پر پہلی مرتبہ منکشف ہوا کہ اسلام ایک ہمہ گیر
نظام حیات کا نام ہے، اور ہر شعبۂ زندگی میں کیسی تبدیلی
ان کے نزدیک مطلوب ہے، قوم کے اندر اسلام
ایک اجتماعی نصب العین بن گیا اور جماعت اسلامی کی
ان ہی حقیر کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اس کے بعد کوئی
طاقت ملک کو اسلام کی شاہراہ سے منحرف نہ کر سکی
اور دستور کا جو بھی ڈھانچہ تیار ہوا اس کی بنیاد سے
تمام سازشوں کے باوجود اسلام کو خارج نہ کیا جا سکا۔
اگر جماعت اسلامی محض تبلیغی جماعت بن کر رہتی
اور سیاسی محاذ پر اسلام کی قوت کا اظہار نہ کرتی تو کیا
قرارداد مقاصد منظور ہو سکتی تھی؟ دستور ۱۹۵۶ء بنتا؟
دستور ۱۹۷۳ء میں کتاب و سنت کے الفاظ اور اسلامی

دفعات رکھی جاتیں؟ سوشلسٹ پیپلز پارٹی کے مقتدر ہونے
کے باوجود دستور ۱۹۷۳ء میں اسلام کی آب و تاب دکھائی دیتی!
مولانا اصلاحی کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی کو پاکستان میں اسلام
کی سربلندی کے لیے کتنا خون اور کتنا پسینہ دینا پڑا؟
قرارداد مقاصد کے بعد سے اسلام کے خلاف سازشیں
شروع ہو گئی تھیں، دستور ۱۹۵۶ء محض اس لیے لپیٹ دیا گیا
کہ اس میں اسلام کے مستقبل کی ضمانت تھی، حقیقت یہ ہے
کہ قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد پاکستان میں دینی فکر
جھلکتا تھا جو ملی دور کی ہر شعبۂ زندگی میں دکھائی دیتا تھا۔
دستور ۱۹۵۶ء اگرچہ منظور ہو گیا تھا لیکن اس کی تنسیخ کے لیے زیر
سطح ریشہ دوانیاں شروع ہو گئی تھیں، دستور ۱۹۵۶ء کے
تحت مجوزہ انتخابات عام سے قبل کراچی کے بلدیاتی انتخابات
میں جماعت اسلامی کی حیرت انگیز کامیابی نے مقتدر لادین
طبقے کے لیے خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی، دستور ۱۹۵۶ء اور جماعت
اسلامی کا راستہ روکنے کی تیاریاں اندر ہی اندر شروع ہو گئیں
۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کی صبح کو اہل پاکستان بیدار ہوئے تو وہ یہ
دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے کہ ایک سازش نے جس کو
انقلاب کا نام دیا گیا تھا، نہ صرف دستور ۱۹۵۶ء کی بساط
لپیٹ دی تھی، بلکہ جمہوریت اور اسلام کے مستقبل کو
بھی دھندلا کر دیا تھا۔
جنرل ایوب خان کے مقابلے میں مولانا مودودی کا موقف بالکل
واضح تھا، تاریخ ان شقیان کرام اور فدائیان اسلام کی جدوجہد
کی گواہ رہی ہے، وہ زندہ دلیلیں کہ اس مرحلے پر ملک اور اسلام
کے ساتھ کیا کیا، ایوب خان پاکستان کے لیے سیکولر نظام
دستور کے سلسلے میں غلام محمد اور اسکندر مرزا کا ہو بہو طرح

مغربیت زدہ اور تحریک ساز شخص تھا، اس کے نزدیک اسلام مذہب تو ٹھیک تھا، لیکن وہ نظام حکومت نہیں بن سکتا تھا، اپنے سیاسی سوانح "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" میں وہ علماء کے خلاف اپنی تحقیر کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا اور ان علماء پر کھلم کھلا تنقید کرتا ہے جو سیاست کو دین کے تابع رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ اس کے نزدیک دین کو سیاست سے الگ رہنا چاہئے تھا، پھر وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ تحریک پاکستان حقیقت میں نئے تعلیم یافتہ طبقے کی علماء کی قیادت کے خلاف بغاوت تھی، ایوب خان کے الفاظ میں "پاکستان کا قیام علماء کی زبردست شکست تھا" اس ایک جملے سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے حقیقی خیالات کیا تھے، اور وہ کتنا دین پسند تھا، اس کی دین پسندی کی ایک اور جھلک اس فقرے سے بھی مل سکتی ہے کہ

> آبادی کی کثرت اور وراثت کے قوانین کی بنا پر زمین بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے، جو اقتصادی طور پر غیر مفید ہے۔
> (جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی)

یعنی اس کے نزدیک قانون وراثت اس لحاظ سے قابل مذمت نہیں کہ اس سے زمین چھوٹے چھوٹے اقتصادی طور پر غیر نفع بخش ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گئی ہے، کیا کوئی محب دین ایسی بات کہہ سکتا ہے؟ پھر چوالیس ماہ کے طویل مارشل لاء میں ایوب خان نے پاکستانی معاشرے کو اپنے خوابوں کے سانچے میں ڈھالنے کی ابتداء کی، اس کا آغاز عائلی قوانین کے نفاذ سے ہوا جس میں شریعت کے مسلمہ اصولوں کی بڑی جرأت کے ساتھ صریح خلاف ورزی کی گئی تھی، ان عائلی قوانین میں شریعت کے واضح احکام احکام کو جس دلیری اور ڈھٹائی سے پامال کیا گیا تھا اس کے چند نمونے درج ذیل ہیں۔

۱۔ پوتے کو وراثت میں حقدار قرار دیا گیا۔

۲۔ نکاح کے لئے رجسٹری شرط رکھی گئی۔

یعنی شریعت کی مقرر کردہ شرط ایجاب و قبول اور گواہوں کی موجودگی نہیں، بلکہ اصل بنیاد نکاح رجسٹری ہے۔ ایک نکاح شریعت کے نزدیک جائز ہے لیکن اگر رجسٹر نہیں ہوا تو حکومت کی نگاہ میں یہ نکاح نہیں ہوا۔

۳۔ طلاق کا نفاذ خاوند کے ہاتھ سے لے کر یونین کونسل کے چیرمین کے ہاتھ میں دے دیا گیا، یعنی کوئی طلاق موثر نہیں ہو سکتی جب تک چیرمین اس کی توثیق نہ کرے، اور عدت کے لئے میعاد حیض ایام نہیں بلکہ نوے دن مقرر کئے گئے گویا ایام سرکاری حکم نامے کے پابند ہیں۔

۴۔ نکاح ثانی پر پابندی لگا دی گئی یعنی ایک شخص ایک عورت سے غیر شرعی تعلق تو رکھ سکتا ہے، لیکن (بلا اجازت) شرعی تعلق نہیں رکھ سکتا۔ عائلی قوانین کے تحت ایک عدالت نے واقعۃً ایک شادی شدہ شخص کو اس بنا پر بری کر دیا کہ اس نے ثابت کیا کہ دوسری عورت سے اس کا نکاح نہیں، ویسے تعلقات ہیں۔

اس قانون پر دین کا شعور رکھنے والے تڑپ اٹھے

اور جید علماء نے اس قانون کو متفقہ طور پر غیر شرعی اور دین میں صریح مداخلت اور تحریف قرار دیا۔ ان علماء میں "قومی سیاست" اختیار کرنے والے "مولانا مودودی" بھی تھے۔ ملک گیر تحریک یہ ہے کہ یہ انہی کی تحریک کا نتیجہ تھا کہ علماء کا ایک متفقہ موقف اس قانون کے بارے میں تیار ہو گیا۔

اس پر اس مرد کی حکومتی مشینری حرکت میں آ گئی اور تمام علماء کی طلبیاں ہوئیں۔ جس کسی نے عائلی قانون کے خلاف آواز بلند کی، اسے جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ کسی کو اس قانون کے خلاف تو کچھ کہنے کی اجازت نہ تھی، البتہ اس کے حق میں جلوس نکالنے کی پوری آزادی تھی۔

ایوب خان کا چوالیس ماہ کا مارشل لاء رہا آخر ایک ایسے دستور پر منتج ہوا جو ایوب خان نے قوم سے مشورہ کئے بغیر از خود تیار کر کے قوم کے سر تھوپ دیا تھا۔ اس دستور میں دستور ۱۹۵۶ء کے کتاب و سنت کے الفاظ کاٹ کر ان کی جگہ اسلام کا لفظ رکھ دیا۔ حکمت اس تبدیلی کی یہ تھی کہ کتاب و سنت سے اسلام کا مفہوم متعین ہو جاتا ہے جبکہ صرف اسلام کے لفظ کی وسعت میں ہر قسم کی بے معانی بھی سما سکتی ہے۔

مولانا مودودی کے سیکولرازم کو مسلط کرنے کی ان خفیہ چالوں پر احتجاج کیا اور تحریک اٹھائی، اس کے جواب میں پہلے جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع پر سرکاری غنڈوں کے ذریعہ حملہ کرایا گیا جس میں جماعت کا ایک کارکن شہید ہو گیا، پھر جماعت اسلامی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور اس کے نتیجے میں جماعت کی پوری مرکزی مجلس شوریٰ نظر بند کر دی گئی۔

یہ تھے اس مرد کے کارنامے جس کی مخالفت کی جسارت یہ مولانا تھانوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی الحفیظ و [illegible] رہے ہیں۔ ان کے مقابلے میں محترمہ مس فاطمہ جناح نے نہ صرف ہر نوع کے غیر اسلامی قوانین کی منسوخی کا وعدہ کیا، بلکہ کتاب و سنت کے مطابق قانون سازی کو اپنے منشور میں بھی شامل کر لیا۔

اب ہم پوچھتے ہیں کہ ایسی صورت میں ایک مسلمان کو کیا کرنا چاہیے؟ ایک طرف ایک مرد ہے جو شریعت کو پوری بے باکی کے ساتھ پامال کر رہا ہے اور مسلمانوں کے ملک کو اسلام کی بجائے سیکولرازم کی راہ پر ڈالنا چاہتا ہے دوسری طرف ایک عورت ہے، جو بحالی شریعت اور نفاذ اسلام کا وعدہ کرتی ہے اور اس کے بارے میں گمان ہے کہ جابر کا موثر مقابلہ صرف وہی کر سکتی ہے۔

حالات سے ناواقف حجرے کی چار دیواری میں بند ایک محدود ذہن کا کتاب خواں جو فتویٰ چاہے دے لیکن کیا یہ بات ان اہل علم کو بھی زیب دیتی ہے کہ وہ مولانا مودودیؒ کے بغض میں مرد ہونے ہی کو تمام پہلوؤں پر حاوی اور فیصلہ کن قرار دیں؟

یہ پاکستان کے اس زمانے کے حالات کا مختصر بیان تھا لیکن محض دینی نقطہ نظر سے بھی مولانا مودودی کا عورت کے حق میں فیصلہ دے دینا دینی جرم نہیں ہے، اگر حدیث کی رو سے بعض اہل علم کے نزدیک عورت کا والی و حاکم ہونا موجب عدم فلاح ہے تو بعض کے نزدیک اس کا اطلاق موجودہ زمانے کی جمہوری حکومتوں پر نہیں ہوتا۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نزدیک [illegible]

دور کے جمہوری نظام اس حدیث کا محل نہیں ہیں، کیونکہ اس میں فیصلہ کرنے والی عورت تنہا نہیں ہوتی اس کے ساتھ قوم کے مرد نمائندے اور مشیر بھی ہوتے ہیں" ملاحظہ ہو اداء الفتاوی جلد پنجم ص۹۹ ۔

اگر مولانا مودودی آیت کی تفسیر پر نعمانی صاحب کا قول پیہ اقتدار کھکر "یا بدیع العجائب" پکارتے ہیں تو فرمایئے کہ حضرت تھانوی کے اس فقرے پر ان کا کیا رد عمل ہے؟ کیا ان کی یہ تعبیر بھی سیاسی ہے؟

اور اب تو اہل دیوبند نے اپنی صد سالہ تقریبات تک میں عورت کو مدعو کر کے خوش بہت کر دیا ہے کہ عورت کا سربراہ ہونا ممنوع نہیں ہے، بلکہ خالص دینی تقریبات میں کسی مشرکہ و کافرہ کی شرکت بھی منافی دین نہیں ہے۔

نعمانی صاحب نے ہر بیان میں اپنے آپ کو عاجز اور ناکارہ لکھتے ہیں جس سے تاثر ہوتا ہے گویا جو کچھ بھی وہ کہہ رہے ہیں، بڑی احتیاط، خدا خوفی اور بے نفسی سے کہہ رہے ہیں، لیکن اس تواضع کے پردے میں ڈالے نشتر چبھوتے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ کیا عاجز لوگ بھی ایسا کر سکتے ہیں؟ ان کا دعویٰ ہے کہ:-

> جماعت اسلامی میں ۹۸ - ۹۹ فیصد ایسے حضرات ہیں جن کے علم دین کا ماخذ صرف مودودی صاحب اور ان کی تصانیف ہیں اور ایک دو فیصد ایسے حضرات ہوں گے جو بوقت ضرورت کتاب و سنت اور قدیم اسلامی کتب خانے کی طرف رجوع کر سکیں۔

پھر نام بنام علمی حدود اربعہ پیش کرتے ہیں کہ میاں طفیل محمد صاحب اور پروفیسر غفور احمد صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:-

> جہاں تک مجھے علم ہے، ان حضرات نے یا علم دین کا سرمایہ بس وہی ہے جو انھوں نے مودودی صاحب اور ان جیسے دوسرے حضرات کی کتابوں سے حاصل کیا ہے اور انھوں نے ان کی ذہنی تربیت کی ہے۔"

ایک طرف مولانا کا یہ دعویٰ دوسری طرف معلومات کا یہ حال ہے، لکھتے ہیں کہ مولانا مودودی نے اپنی نگرانی میں

> "میاں طفیل محمد صاحب کو امیر اور پروفیسر غفور صاحب کو جماعت اسلامی کا سکریٹری جنرل بنایا۔

پروفیسر غفور صاحب جماعت اسلامی پاکستان کے نہیں ——— بلکہ قومی اتحاد پاکستان کے جنرل سکریٹری تھے۔

ان اقتباسات کو دوبارہ سہ بارہ پڑھئے، ان میں عجز و انکساری کی کوئی رمق دکھائی دیتی ہے، حضرت عام معاشرتی شائستگی کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے؟ آپ نے یہ کیسا دعویٰ کر دیا ہے کہ میاں طفیل محمد اور پروفیسر غفور کا مبلغ علم بالواسطہ، کیا آپ ان کے نگراں رہے ہیں؟ لا تقف ما لیس لک بہ علم۔ میاں طفیل محمد اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خدمت دین کے جس مقام پر ہیں، اس کا اندازہ جب ایک دن ہوگا، وہ علوم دینی کی ظاہری سند سے اگرچہ محروم ہیں، لیکن وہ اس سنت پر عمل سے مالا مال ہیں کہ انھوں نے کسی کا نام لے کر کبھی کوئی بے بنیاد بات نہیں کہی۔

نعمانی صاحب اس کے ساتھ میاں صاحب کے بارے عزیز دوست بھی لکھتے ہیں کہ سوال یہ ہے ... کبھی

کی تبشیر ہی کرنی ہے تو پھر ذاتی تعلقات جتانے کی کیا حاجت!
آدمی پر بچپن کے بعد جوانی اور پختگی عمر کے ادوار بھی آتے
ہیں، نعمانی صاحب نے غلط کیا ہوگا کہ میاں طفیل محمد بھی کاتب ہی
رہے ہوں گے، جہاں انھوں نے انھیں دارالاسلام میں
دیکھا تھا، کیا عجیب طرز استدلال ہے!

اب کیا نعمانی صاحب کے جواب میں ہم جماعت اسلامی کے
متدین علماء اور اہل علم دین کی فہرست پیش کریں؟ مولانا
مودودی نے ایک مرتبہ فرمایا تھا، ہم نہیں ہمارا کام آگے
بڑھے گا، اگر جماعت اسلامی کی دعوت اور کام میں حقیقت
دین ہے تو انشاء اللہ اس کا مقام خود بنے گا اور راستے اس
کے لئے خود صاف ہوں گے۔ جوابی دعووں کی ضرورت
نہیں، اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس میں کتنے فیصد عالم، کتنے
فیصد علم دین سے بہرہ مند اور کتنے فیصد جدید تعلیم یافتہ لیکن
دین کے لئے ہر قربانی دینے والے ہیں، ہم صرف گذارش
کریں گے کہ ــ

خاکساران جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ درین گرد سوارے باشد

غضب کی اس رو میں نعمانی صاحب ایک عجیب بات
کہہ گئے جو صرف ایک نابختہ شخص ہی کہہ سکتا ہے، ملاحظہ
ہو، فرماتے ہیں:ــ

"جماعت اسلامی پاکستان جو اصل جماعت
اسلامی ہے اور باقی ہندوستان یا کشمیر میں تو
بس اس کی گویا شاخیں ہیں، اسکے بانی اور
رہنما مولانا مودودی ہیں!"

تو کیا نعمانی صاحب کو مسند ہندو بنگلہ کے فرقہ پرست
مسلم دشمن عناصر پہ تیار "کھوٹنا چاہتے ہیں کہ جماعت اسلامی
ہند اور جماعت اسلامی کشمیر حقیقت میں پاکستان کی جماعت
اسلامی ہی کی ذیلی شاخیں ہیں، اور ان کو تمام تر رہنمائی
پاکستان سے ملتی ہے؟ ایسی بات کوئی سیاسی دشمن بھی
نہیں کہہ سکتا، یہ انکشاف حقیقت نہیں مخبری ہے۔

جماعت اسلامی کی مجموعی کم مائیگی علم ظاہر کرکے
مولانا اگر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جن کا علم بالواسطہ ہو اور اصل
سرچشمۂ دین تک ان کی رسائی نہ ہو، وہ دینی قیادت
کیسے فراہم کر سکتے ہیں، تو ہم بڑے شوق و تجسس سے
پوچھنا چاہیں گے کہ موجودہ دینی مدرسوں نے ملت کو کتنے
قائد فراہم کئے ہیں، اور جو نصاب وہاں پر پڑھایا جاتا ہے
وہ کتنی قائدانہ صلاحیت بخشتا ہے؟ اگر مستند عالم ہونا
ہی شرط قیادت ہے تو پھر بتایا جائے کہ سید احمد شہیدؒ
کس پایہ کے عالم تھے؟ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ
اور عبدالحی صاحب جیسے بڑے عالم ان کی پیروی پر کیوں
مجبور تھے؟ سید شہیدؒ کی جماعت میں کتنے علماء دین تھے؟
اور اب جو علماء دین مولانا نعمانی کے مکتب فکر سے پیدا ہوتے
ہیں ملت کو ان سے کتنی قیادت فراہم ہوئی ہے؟

دینی عالم بننے کا کام نہیں، اتنا عربی احکام پڑھنے کا کام
ہے، اگر عربی زبان دانی ہی معیار دینی شعور ہے تو پھر عہد
قدیم کے ابوجہل و ابولہب دین کے بہت بڑے عالم تھے
اور آج بھی بعض مستشرقین کو دیکھئے ان کا علم زبان عربی
حیرت انگیز ہے، دین اتباع شریعت اور اس کے لئے
جذبۂ اخلاص و فداکاری کا نام ہے، ان جنوں کا نام ہے
کہ اللہ اور رسول کا نام لینے والے اللہ و رسول کے عشق

(باقی صفحہ پر)